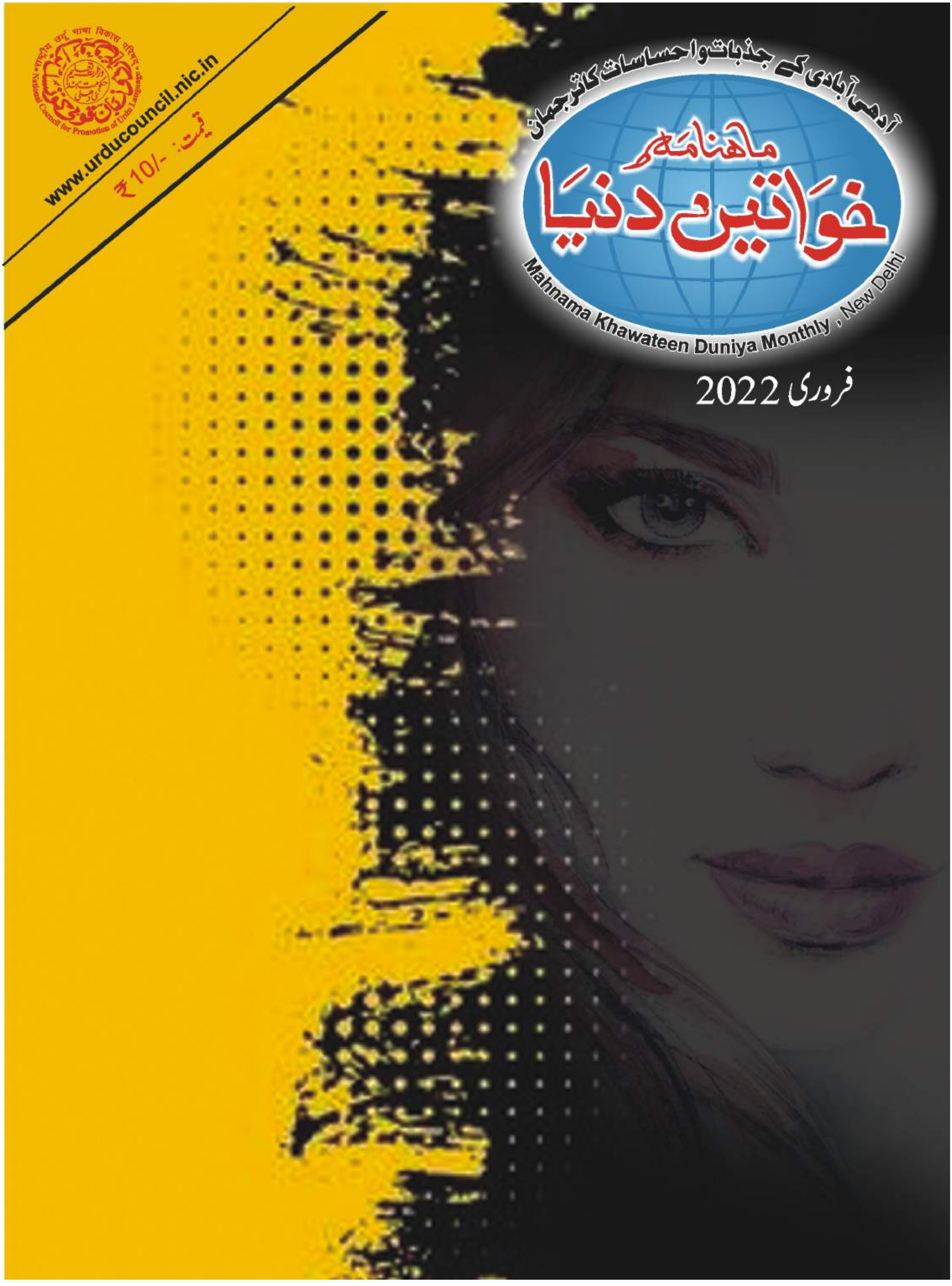
National Council for Promotion of Urdu Language
www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10₹
آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi
فروری 2022

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

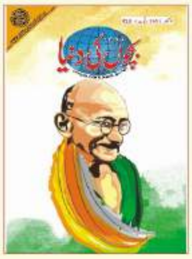

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:6 شمارہ:2 فروری 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	بلبل ہند سروجنی نائیڈو	ڈاکٹر آفاق ندیم خان	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	امرتا پریتم کے ناول 'پنجر' کا تجزیاتی مطالعہ	شمس الہدیٰ انصاری	10
	رواں صدی میں خواتین کی سفرنامہ نگاری	محمد شفیق	13
	قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا جائزہ	ڈاکٹر حسینہ خانم	18
	صالحہ عابد حسین کی فکشن نگاری	زینت جہاں	23
اعتراف ہنر	مظہر الزماں خاں: ہمارے عہد کا آخری داستان گو	ڈاکٹر رفیعہ سلیم	30
	ہاجرہ بانو کی انشائیہ نگاری کا فکری جائزہ	مختار احمد میر	36
حسن سخن	ایمن تنزیل، علیزے نجف، خوشبو پروین		41
افسانہ	درد کی وادی میں بکھر گئے خواب	خیر النساء علیم	43
	لاڈلی	انزیلہ معین الدین	49
	سراب اور سمندر	عرفانہ تزئین شبنم	52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	ورزش اور صحت	ڈاکٹر محمد افروز عالم	56
آرائش و زیبائش			60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

مشعل

دنیا میں جتنے بھی طبقات ہیں سب کی زندگی کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسائل جڑے ہی رہتے ہیں۔عالمی سطح پر تمام طبقوں کی مشکلات اور مسائل یکساں ہوتے ہیں مگر مقام اور علاقے کے اعتبار سے کچھ فرق آ ہی جاتا ہے۔خواتین کے ساتھ بھی معاملہ یہ ہے کہ دنیا کی بیشتر خواتین کے دکھ درد، کرب اور اذیت، خواب اور عذاب، خوشی اور غم یکساں ہیں مگر علاقوں کے اعتبار سے ان کے مسائل بھی تھوڑے بہت الگ ہیں۔ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کی خواتین کے مسائل نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں خواتین کو معاشی، سماجی آزادی حاصل ہے اور انھیں ترقی کے بہت سے مواقع بھی میسر ہیں۔معاشی زندگی میں وہاں عورتوں کی قابل ذکر شراکت داری بھی ہے۔ڈیجیٹل ایج نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی ان کے لیے بہت سی نئی راہیں کھول دی ہیں اور ان ممالک میں عورتوں کا امپاورمنٹ بھی ہوا ہے۔مگر پسماندہ ممالک کی خواتین اب بھی صنفی تفریق کی شکار ہیں۔انھیں وہ مواقع میسر نہیں جو مردوں کو حاصل ہے۔اس لیے ان ممالک کی خواتین کو تعلیم، ٹکنالوجی اور تجارت کے میدان میں بہت سی محرومیوں کا سامنا ہے۔حکومتیں مختلف اسکیموں اور اقدامات کے تحت ان کی محرومیوں کا مداوا کرتی ہیں پھر بھی زیادہ تر خواتین ان سے فائدہ نہیں اٹھا پاتی ہیں۔

بہر حال یہ خوش آئند بات ہے کہ موجودہ حالات میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔خواتین کی صورت حال بھی بدلی ہے انھیں اپنے بنیادی حقوق کا ادراک بھی ہے اور بہت سی سطحوں پر بیداری بھی آئی ہے اور خواتین اپنے جائز حقوق کے لیے احتجاج بھی کر رہی ہیں۔یقینی طور پر آج کے ڈیجیٹل ایج میں عورتیں اپنے بنیادی مسائل اور حقوق سے آگاہ ہو رہی ہیں اور انھیں یہ احساس بھی ہو رہا ہے کہ ماضی میں جس جبر کی وہ شکار تھیں اس کا سلسلہ کچھ تھم سا رہا ہے۔پھر بھی ضرورت ہے کہ خواتین کو ان کے تمام حقوق اور اختیارات سے آگاہ کیا جائے اور انھیں ہر شعبۂ حیات میں ان کے ذوق اور ذہنی سطح کے لحاظ سے مواقع دیے جائیں تاکہ معاشرتی اور معاشی زندگی میں ان کی شراکت داری بڑھے۔

آج خواتین کی ایک بڑی تعداد تعلیم نسواں کے تئیں بیدار ہے اور عورتوں میں تعلیم کی شمع جلانے کے لیے کوشاں ہے۔اس کے بہت مفید اور ثمر آور نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں کہ خواتین کی شرح خواندگی بڑھ رہی ہے۔خاص طور پر سائنس، ٹکنالوجی، میڈیسن، انجینئرنگ، ریاضیات اور دیگر شعبوں میں خواتین اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔تجارت کے میدان میں بھی خواتین کامیابی کے پرچم بلند کر رہی ہیں۔یہ تمام اشارات صحتمند اور مثبت ہیں۔اس سے یقینی طور پر عورتوں کا مستقبل ہر محاذ پر روشن اور تابناک ہوگا۔خواتین نے اگر اپنی جدوجہد جاری رکھی تو تمام میدانوں میں وہ کامرانی کی نئی تاریخ رقم کر سکتی ہیں۔ایسی بہت سی مثالیں ہیں مسائل اور مشکلات کے باوجود خواتین نے کامیابی کی بلندیاں طے کی ہیں اور معاشرے کو یہ احساس دلایا ہے کہ وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

بلبل ھند
سروجنی نائیڈو

ڈاکٹر آفاق ندیم خان

بلبل ہند کے خطاب سے سرفراز، مجاہدہ آزادی، ہندو مسلم اخوت واتحاد و کی حامی، محبِ وطن، انگریزی کی عظیم شاعرہ، شعلہ بیان مقررہ، بہترین قائد، دانشور اور مدبرانہ صفات کی ملکہ سروجنی نائیڈو حیدرآباد کے ایک برہمن بنگالی خاندان میں 13، فروری 1879 کو پیدا ہوئیں۔ سروجنی نائیڈو کا نام متحدہ ہندوستان کی سیاست، تحریک آزادی اور علم وادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔ سروجنی نائیڈو ان چند خواتین میں شامل ہیں جنہوں نے انگریز حکمرانوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ ہندو مسلم اتحاد اور خواتین کی بااختیاری ان کی سیاست کا جزو لاینفک تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مضبوط انگریز حکومت کے سامنے ملک کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو، مسلم اتحاد اور آدھی آبادی یعنی خواتین کی شمولیت وقت کی ضرورت ہے۔ سروجنی نائیڈو کی بے مثال ادبی اور سیاسی خدمات کی بناء پر ان کو بلبل ہند کے لقب سے پکارا گیا۔

سروجنی نائیڈو کی ابتدائی تعلیم وتربیت حیدرآباد میں ہوئی۔ اس کے بعد سن 1895 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئیں۔ وہاں پر انھوں نے پہلے کنگ یونیورسٹی اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں سے ان کی شاعری کا بھی باضابطہ آغاز ہوا۔ سروجنی نائیڈو کے والد انھیں سائنس داں بنانا چاہتے تھے لیکن انھیں شعروشاعری سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے صرف 13 سال کی عمر میں ہی 1,300 مصرعوں پر مشتمل طویل نظم اور 2,000 سطروں کا ایک طویل ناٹک لکھ کر انگریزی زبان میں اپنی قابلیت کی مثال پیش کی۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی، انسانی ہمدردی اور قومی یکجہتی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں اگر ایک جانب موذن کی اذان اور پجاری کے بھجن کا ترانہ گایا گیا ہے تو دوسری جانب فقیر کی صدا، پالکی بردار کے گیت، سنترہ بیچنے والے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ 'گولڈن تھریشولڈ' ان کا پہلا شعری مجموعہ تھا۔ ان کے دوسرے اور تیسرے شعری مجموعے 'برڈ آف ٹائم' اور 'بروکن ونگ' نے انھیں ایک مشہور شاعرہ بنا دیا۔ اردو میں ان کے اِن شعری مجموعے کو بتدریج ''طلائی آستانہ''، ''طائر وقت'' اور ''شکستہ پر'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں بھی فصاحت، بلاغت، روانی خیالات کی ندرت اور بے انتہا کشش ہوتی تھی۔ کثیر لسانیت ان کی شخصیت کا اہم پہلو تھا۔ وہ ہندی، انگریزی، اردو، بنگلا اور گجراتی زبان کی بے مثل مقررہ تھیں۔

جس علاقے میں جاتیں وہاں کی زبان میں لوگوں سے گفتگو کرتی تھیں۔ ان کی تقاریر میں مقصدیت، جدوجہد، حب الوطنی، ایثار و قربانی، حوصلہ مندی، اتحاد و اتفاق کے ساتھ ساتھ جنسی مساوات اور قومی یکجہتی کا عنصر غالب رہتا تھا۔ انھیں انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ مختلف ہندوستانی زبانوں پر مکمل عبور تھا، اس لیے ان کی تقاریر میں الفاظ کی آمد اور بیان کی سلاست کا سیلاب ہوتا تھا جو غلام ہندوستانیوں کے دلوں میں جوش و جذبہ اور انگریزوں کے دلوں میں خوف بپا کر دیتا تھا۔ خطروں سے نہ گھبراتے ہوئے ایک بہادر خاتونِ مجاہد کی طرح گاؤں گاؤں، شہر، شہر گھوم کر ملک بھر میں حب الوطنی کی شمع جلاتی رہیں اور ملک کے لوگوں کو ان کے فرائض یاد دلاتی رہیں۔ ان کی تقاریر عوام کے دلوں میں حوصلہ مندی کے جذبات ابھارتی اور وہ ملک کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتے۔ کثیر الزبان ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ جس علاقے میں جاتیں اس علاقے کے مطابق اپنی تقریر انگریزی، ہندی، اردو، بنگلا یا گجراتی میں کرتی تھیں جس کا اثر ذہن کے ساتھ ساتھ عوام کے قلوب پر بھی مرتب ہو جاتا۔ چونکہ انگریزی زبان پر ملکہ حاصل تھا اس لیے انھوں نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ انگلینڈ اور امریکہ میں بھی اپنے خیالات اور زورِ خطابت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ لندن کی ایک میٹنگ میں انگریزی میں تقریر کر کے انھوں نے لوگوں کا دل جیت لیا۔

سن 1914 میں ان کی ملاقات گاندھی جی سے لندن میں ہوئی۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انھوں نے خود کو ملک کی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔ دانڈی مارچ کے دوران گاندھی جی کے ساتھ آپ پہلی قطار میں چلنے والی خاتون تھیں۔ انھوں نے تاحیات گاندھی جی کے نظریات کی تقلید کی اور جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک ماہر کمانڈر کی طرح انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے ہر ایک شعبے کو متاثر کیا۔ اپنی مقبولیت اور صلاحیت کی بنا پر سن 1925 میں انڈین نیشنل کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں۔ 1932 میں ہندوستان کی نمائندہ بن کر جنوبی افریقہ بھی گئیں۔ گاندھی جی کے سَوِنے اَوَگیا تحریک میں وہ ان کے ساتھ جیل بھی گئیں۔ بھارت چھوڑو تحریک کے دوران سن 1942 میں سروجنی نائیڈو کو 21 مہینہ کے لیے جیل جانا پڑا۔ آزادی کے بعد انھیں صوبہ اتر پردیش کا گورنر بنایا گیا۔

ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو خواتین کی بااختیاری کے لیے آواز بلند کرنا تھا۔ برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستانی خواتین کی آزادی، بااختیاری، تعلیم اور سماجی اصلاح کے لیے سروجنی نائیڈو نے اہم کردار کیا۔ وہ نوآبادیاتی حکومت کے خلاف عوامی خطیب کے طور پر قومی تحریک میں شامل ہوئیں اور اپنی پوری زندگی نہ صرف آزادی بلکہ خواتین کی آزادی کے لیے وقف کر دی۔ وہ ہندوستانی جدوجہد آزادی میں پہلی خاتون تھیں جن کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آزادی ایک دور کا خواب ہے، جب تک کہ خواتین کی قابل رحم حالت بحال نہیں ہو جاتی خواتین کے حقوق کی لڑائی سروجنی نائیڈو کے لیے تشویش انا کا مسئلہ بن گئی۔ اپنی مختلف تقاریر کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی خواتین کی بہتری کے لیے کام کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم، پردہ، جبریہ بیوگی، بیوہ خواتین کی دوبارہ شادی، طلاق، سماجی معذوریوں کو دور کرنے کے لیے پورے ہندوستان میں اپنی تقاریر کے ذریعے لوگوں کو بیدار کیا۔ انھوں نے 'ہندوستان کی مستقبل کی خواتین' کا ایک وژن بھی پیش کیا۔

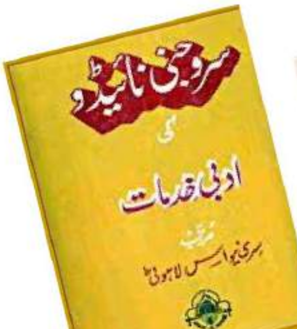

سروجنی نائیڈو نے دسمبر 1904 میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کے 18ویں سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ اس سیشن میں سروجنی نائیڈو نے بڑے ہجوم اور خواتین کے اجلاس سے خطاب کیا۔ مرکزی کانفرنس کے غور و خوض کا ایک بڑا حصہ تقریباً مکمل طور پر خواتین کی آزادی کے لیے تھا۔ اس اجلاس میں خواتین کی تعلیم، سماجی حیثیت، بچپن کی شادی، بیوہ کی دوبارہ شادی، تعدد ازدواج، پردہ نظام اور ان کے کیریئر جیسے مسائل

پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس خاص میٹنگ میں سروجنی نائیڈو نے حب الوطنی نظم 'ٹو انڈیا' سنائی جس کے بول تھے؛ ماں، اے ماں، آپ کیوں سوتی ہو؟ اٹھو اور اپنے بچوں کی خاطر جواب دو! آپ کا مستقبل آپ کو بہت ساری آواز کے ساتھ اعزازات، شان وشوکت، وسیع فتوحات کی طرف بلاتا ہے۔ اس نظم کے ذریعے انھوں نے سوئی ہوئی مادر وطن ہندوستان کو جگانے کی کوشش کی اور کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ آگے آئیں اور اپنے بچوں کو آزادی کی روشنی دکھائیں۔ اس نظم کو ہندوستانی عوام نے بے حد پسند کیا۔ اس میٹنگ میں انھوں نے مردوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ان سے پرزور التجا کی کہ وہ اپنی بیویوں کو وہ آزادی دیں جو ان کا پیدائشی حق ہے۔

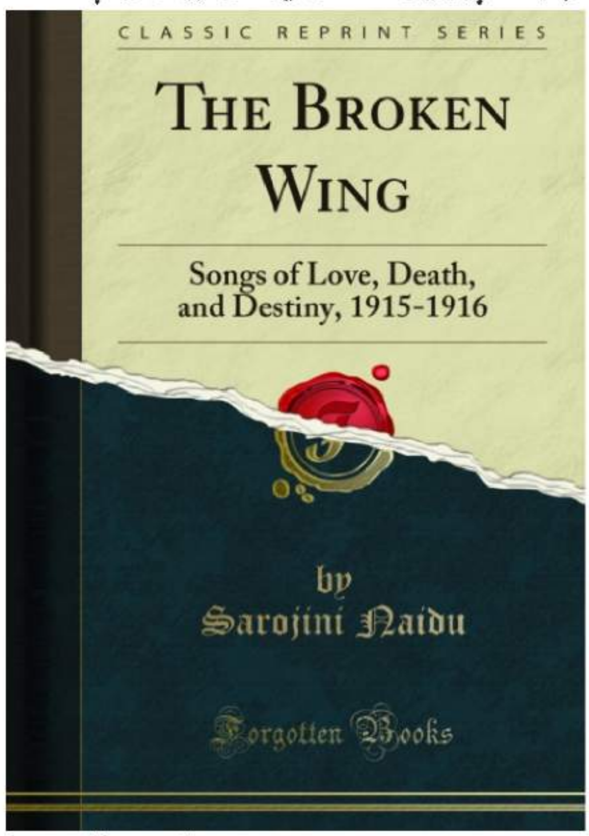

بہت جلد، اپنے گہرے سماجی شعور اور اپنی متحرک توانائی کی وجہ سے سروجنی نائیڈو مستقبل کے آنے والے سالوں میں ہندوستانی خواتین کی رہنما بن گئیں۔ جب 1906 میں سودیشی تحریک اپنے عروج پر تھی، سروجنی نائیڈو نے کلکتہ میں انڈین سوشل کانفرنس میں "ہندوستانی خواتین کی تعلیم" کے موضوع پر بات کی۔ سروجنی نائیڈو نے محسوس کیا کہ ذات پات، برادری یا مسلک کی کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اعلیٰ ترین باصلاحیت اور وسیع ثقافت کی حامل خواتین کی روشن مثال ہندوستان میں پہلے سے ہی موجود ہے، لیکن بدقسمتی سے ہم آگے نہیں بڑھ سکے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہم سال بہ سال خواتین کی تعلیم کے حق میں صرف قرارداد پاس کرنے سے زیادہ نتیجہ خیز چیزیں کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ایک مشترکہ قومی معیار کے لیے جدوجہد کرنے کی پوری تحریک "خواتین کے سوال" پر مرکوز ہونی چاہیے۔ خواتین کی تعلیم قوم کی تعمیر کے عمل میں ایک لازمی عنصر ہے۔ انسان کی جرأت کیسے ہوتی ہے کہ وہ پاکیزہ انسانی روح کو آزادی اور زندگی کی قدیم وراثت سے محروم کردے جو اس کے جسم کی پرورش کرتی ہے؟ انھوں نے کانفرنس میں موجود مردوں سے کہا کہ 'میں آپ سے خواتین کے قدیم حقوق کو بحال کرنے کی تلقین کرتی ہوں۔ یہ ہم ہیں، آپ نہیں، جو حقیقی قوم ساز ہیں اور ترقی کے تمام موڑ پر ہمارے فعال تعاون کے بغیر، آپ کی تمام کانگریس اور تمام کانفرنس بیکار ہیں'۔

اپنی تقریر کے ذریعے وہ خواتین کی تعلیم کے لیے ہندوستانی عوام کو باشعور بنانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ انھوں نے محسوس کیا کہ خواتین کی ابتر حالت کو بہتر بنانے کے لیے تعلیم سب سے اہم آلہ ہے۔ سروجنی نائیڈو نے محبوب کالج ہال، سکندرآباد میں ہندو سماجی اصلاحی انجمن کے اجلاس کی صدارت فرماتے ہوئے بے خوفی کے ساتھ بچوں کی شادی، سماجی اور مذہبی مواقع پر بے جا خرچ اور شادی کے وقت لڑکیوں اور مردوں کے درمیان عمر کے وسیع تفاوت کی مخالفت کی۔ 10 مارچ 1908 کو بمبئی کے ایک اجلاس میں سروجنی نائیڈو نے ''پردہ سسٹم'' کے خاتمے کی پرزور اپیل کی۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انگریزی میں فصیح و بلیغ خطاب کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ پردہ کا نظام اس ملک میں سماجی اصلاح کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پردہ نظام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دماغ پر بھی پردہ ہو اور روح پر بھی پردہ ہو۔ انھوں نے ایک نظم 'دہ نشین' لکھی جس میں انھوں نے پردہ کو عفت اور عظمت کی نشانی بتایا، لیکن ان کا خیال تھا کہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے بھی خواتین تعلیم وتربیت حاصل کرکے ملک کے لیے افادی کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ملک کی بہتری کے لیے مرد وخواتین دونوں کی شمولیت ضروری ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ " آپ سیاسی حقوق کے طلب گار ہیں۔ مت بھولیے کہ ایک لنگڑا آدمی چل تو سکتا ہے لیکن دھیرے، ایک آنکھ کا آدمی دیکھ تو سکتا ہے لیکن صرف ایک طرف اور ایک گاڑی ایک پہیے کے ساتھ اچھی طرح نہیں چل سکتی۔" اس تقریر میں وہ کہنا چاہتی تھیں کہ بغیر خواتین کی شرکت کے آپ انگریزی حکومت سے آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے ہندوستانی

خواتین کی حالت کو بہتر کرنا ہوگا۔ مارچ 1918 کو انھوں نے کنیا مہا ودیالیہ جالندھر میں ہندوستان کی مستقبل کی خواتین کا وژن پیش کیا۔ انھوں نے کہا ''خواتین صرف آپ کے گھر کا چولہا جلانے کے لیے نہیں ہیں بلکہ وہ قومی زندگی کی مشعل بھی لے کر چل سکتی ہیں۔''

سروجنی نائیڈو ہندوستانی سماج میں خواتین با اختیاری کا ایسا چہرہ ہے جو ملک کی بچیوں اور خواتین کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزی حکومت کی قید و بند کو برداشت کرتے ہوئے انھوں نے خود کو خاتونِ آہن ثابت کیا۔ بطور مجاہدہ آزادی، ادیبہ اور کہنہ مشق شاعرہ ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا انتقال 2، مارچ 1949ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

حواشی / کتابیات:

1. Banerjee Hasi., Sarojini Naidu, The Traditional Feminist, K.P. Bagchi & Co, (1998).

2. Speeches and Writings of Sarojini Naidu, Rajat Publication, (2012).

3. Chaudhary Rakhi., Political Biography of Sarojini Naidu; Contribution in Indian Freedom Struggle, Aligarh Muslim University, (2015).

4. Bakshi S.R., Sarojini Naidu; Struggle for Swaraj, Anmol Publication (1991).

□□□

Dr.Afaque Nadeem Khan

(Assistant Professor)

MANUU, College of Teacher Education

Bhopal-462001 (MP)

Mob. No. 9981995549

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

تھی وہ نگاہِ ناز یا ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہہ کے ہائے دل

سلطان بیگم سلطان

کچھ اس قدر کھو گئی میں تیرے خیال میں
معلوم خود نہیں ہوئی اپنی خبر مجھے

ممتاز جہاں ناز

آ وطن کی خاک کے ذرے بنائیں آفتاب
آ چمن کی ہر کلی سے اک چمن پیدا کریں

بلقیس جمال

جان سی پڑ گئی ہے صحرا میں
چاندنی بہہ رہی ہے دریا میں

صفیہ شمیم ملیح آبادی

کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انھیں اب نہیں گنگا کے کنارے

عزیز جہاں ادا بدایونی

دیکھیے کس ستم کا ہو آغاز
پھر انھیں یاد آ رہی ہوں میں

انوار فاطمہ شمیم لکھنوی

اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا

وہ رنج کرے یا نہ کرے غم نہیں اس کا
سر ہم نے تہہ خنجرِ خونخوار تو رکھا

بیگم دختر نیک میر تقی میر

مصیبتوں میں کوئی کام آ نہیں سکتا
کہ اپنے درد کو دل بھی بٹا نہیں سکتا

خاکساری دہلوی

جسے لوگ کہتے ہیں خورشید رخشاں
شرارہ ہے اک میرے سوزِ نہاں کا

مری آہ کی کار فرمائیاں ہیں
پتہ لا مکاں تک نہیں آسماں کا

قمر النساء قمر

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

دلہن

فکر فردا ہے نہ اب ہم کو خیالِ دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے

بڑھ گئی ہیں بحر آزادی کی طوفاں خیزیاں
اک سفینہ وہ بھی اب طوفاں سے ہم آغوش ہے

رحمت بیگم اسیر

زندگی کو ایک بحر بیکراں پاتی ہوں میں
ان کے ہاتھوں مٹ کے عمر جاوداں پاتی ہوں میں

خود بہ خود دل ہو گیا دونوں جہاں سے بے نیاز
اب زمین عشق گویا آسماں پاتی ہوں میں

چھٹ پٹے سے دل بجھا رہتا ہے تیری یاد میں
چاندنی راتوں میں اشکوں کو رواں پاتی ہوں میں

سیکڑوں سجدے تڑپتے ہیں جبین شوق میں
اے حقیقت تیرا نقشِ پا کہاں پاتی ہوں میں

جمیلہ خاتون تسنیم

ماخذ: تذکرہ شاعرات اردو۔ تالیف محمد جمیل احمد ایم اے بریلوی، ناشر قومی کتب خانہ بریلی

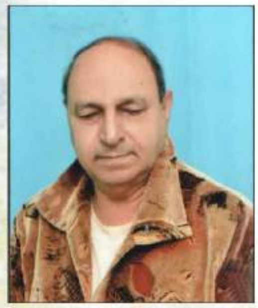

شمس الہدیٰ انصاری

امرتا پریتم کے ناول

'پنجر' کا تجزیاتی مطالعہ

پندرھواں سال لگتے ہی پارو کے انگ انگ میں ہلچل سی مچ گئی۔ پچھلے سال کی سب قمیصیں تنگ ہوگئی تھیں۔ قریب کے منڈی سے پارو نے پھولوں والی چھینٹ کی نئی قمیض سلوائی اور ڑھنیوں کو بہت ابرق لگایا۔ پارو کی سہیلیوں نے اس کے منگیتر رام چندر کو اسے دور سے دکھلا دیا تھا۔ پارو کی آنکھوں میں اس کی صورت بس گئی۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پارو کا منھ لال ہوجاتا تھا۔

امرتا پریتم کے ناول 'پنجر' میں ایک جہان معنی مضمر ہے۔ کائنات کی مختلف سطحیں ان کے اس ناول میں روشن ہے۔ انھوں نے فکشن کو ایک ایسی مشعل عطا کی ہے، جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہوسکتی۔ مصنفہ نے بڑے سلیقے سے ایک عورت پارو کے کردار کو مرکز بنا کر تقسیم کے زمانے کے سماجی و خاندانی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ پارو کو مجبوری کے تحت اپنے عزیز، اپنا گاؤں، گھر، مذہب چھوڑنا پڑتا ہے لیکن وہ ثابت قدم رہتی ہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں بھی سکون حاصل نہیں کرپاتی۔ ناول کے آغاز میں ہی اتنا تجسس اور Suspence ہے کہ قاری آخر تک بندھ جاتا ہے۔ موصوفہ کا فنکارانہ انداز قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار پارو اور رشید نے ناول میں جان ڈال دی ہے جس میں داخلی اور خارجی زندگیوں کو بہت ہی موثر، بولڈ، توانا اور ذہن کو جھنجھوڑ دینے والا دکھایا گیا ہے۔ ناول میں اور بھی زندہ جاوید کردار ہیں۔ جنھوں نے اپنی موجودگی سے ناول کو آفاقی بنادیا ہے۔

ناول کی ہیروئن پارو جو ایک گاؤں کے ساہوکار کی لڑکی تھی اس کا اور اس کے بھائی کا رشتہ ادلے بدلے کی شادی پر طے ہوا تھا۔ اپنے منگیتر کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا چہرہ لال ہوجاتا ہے۔ اس کی سہیلیاں اس کو چھیڑتیں ہیں۔ لیکن شادی سے چند روز قبل ہی اس کی زندگی میں ایک طوفان آتا ہے جو کہ سب کچھ اڑا کر لے جاتا ہے۔ اس کے خواب چکنا چور ہوجاتے ہیں۔ اس کی زندگی کے سارے رنگ و آہنگ اڑ جاتے ہیں۔ پارو کو رشید نام کا شخص اٹھا کر لے جاتا ہے۔ وہ تقدیر کے اس فیصلے سے حیران رہ جاتی ہے۔ وہ بیہوش ہوجاتی ہے۔ لیکن جب ہوش آتا ہے تو اپنے گاؤں سے دور جنگل میں بنے ایک گھر میں خود کو پاتی ہے۔ وہاں وہ نہ کچھ کھاتی

ہے نہ پیتی ہے۔ رورو کر اس کا برا حال ہے۔ وہ رشید سے اپنا قصور پوچھتی ہے اور راز کھلتا ہے کہ رشید خاندانی کشیدگی کے سبب اس کو اٹھا کر لے آیا ہے تو پارو دنگ رہ جاتی ہے اور اپنے گھر فرار ہونے کی سعی کرنے لگتی ہے اور ایک دن اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں وہ رشید کی قید سے نکل جاتی ہے اور سیدھے اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔ لیکن پارو کی ماں اور باپ اسے قبول نہیں کرتے! پارو گڑگڑاتی ہے لیکن سب بے سود رہتا ہے۔ ماں کہتی ہے تمھیں ہم کہاں رکھیں گے تمھیں اب کون اپنائے گا۔ تیرا دھرم گیا کیونکہ تو ایک مسلمان کے ساتھ رہ کر آئی ہے۔ پارو کہتی ہے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ''تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو'' پارو نے تڑپ کر کہا۔ ماں کہتی ہے۔ بیٹی پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہے۔ اب یہاں سے چلی جا۔ ماں نے پتہ نہیں کیسا پتھر دل پایا تھا۔ ذرا یہ منظر غیر فطری ہے۔ ماں کی ممتا اس طرح پتھر دل نہیں ہوتی۔

پارو ماں باپ کے گھر سے نکل کر رشید کو ڈھونڈتی ہے اور رشید دوبارہ اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور نکاح کر لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے پارو رشید کی خوشیوں میں دوسروں کی بھلائی میں اپنی خوشی تلاش کرتی ہے۔ رشید ایک دفعہ بیمار ہو جاتا ہے۔ پارو اس کی خوب خدمت کرتی ہے پھر پارو کے ایک بیٹا جنم لیتا ہے جس کو دیکھ کر وہ اپنے دکھ بھولنے کی کوشش کرتی ہے۔ رشید بھی پارو سے جی جان سے محبت کرتا ہے اور اس کی خوشیوں کے لیے ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ جب فساد ہوتے ہیں تو اپنے عزیزوں کے پاس پارو کو جانے کا موقع ملتا ہے۔ پھر بھی وہ رشید کے پاس پلٹ آتی ہے۔

ناول کو ایسی چابک دستی سے لکھا گیا ہے کہ کہیں جھول نہیں۔ مصنفہ نے بڑے موثر انداز میں ایک ایک واقعے کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو کر قلب و جگر کو تڑپایا ہے۔ اس طرح رشید اپنے خاندانی جھگڑے کے باعث پارو کو اغوا کر لیتا ہے اور رشید گویا ہوتا ہے:

''پارو ہمارے شیخ گھرانے میں اور تمھارے ساہوکار گھرانے میں ہمارے دادا کے وقت سے ایک بیر چلا آرہا ہے۔ میرے دادا کی بڑی بہن کو تیرے دادا کے بڑے بیٹے نے زبردستی اغوا کر کے تین راتیں گھر میں رکھا تھا۔ تیرے دادا کی آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظلم ہوا۔ لیکن اس وقت شیخ گھرانہ گنے کی طرح نچڑا ہوا تھا۔ سب خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔ لیکن میرے دادا نے میرے باپ چاچا تاؤ کو قرآن اٹھوا کر قسمیں اٹھوائی تھیں کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔''

رشید اس ناول کا مرکزی اور بہت ہی توانا کردار ہے۔ اس کے کردار کی انفرادیت اور نیک بختی یہ ہے کہ اس کے سامنے جوان اور خوبصورت لڑکی ہے لیکن اس کی نیت نہیں ڈگمگاتی۔ وہ اس کو اغوا ضرور کر لایا ہے لیکن رشید پارو کی عزت و عفت کی حفاظت کرتا ہے۔ اس سے نکاح کر کے بڑی عزت سے اپنی بیوی بنا کر رکھتا ہے۔

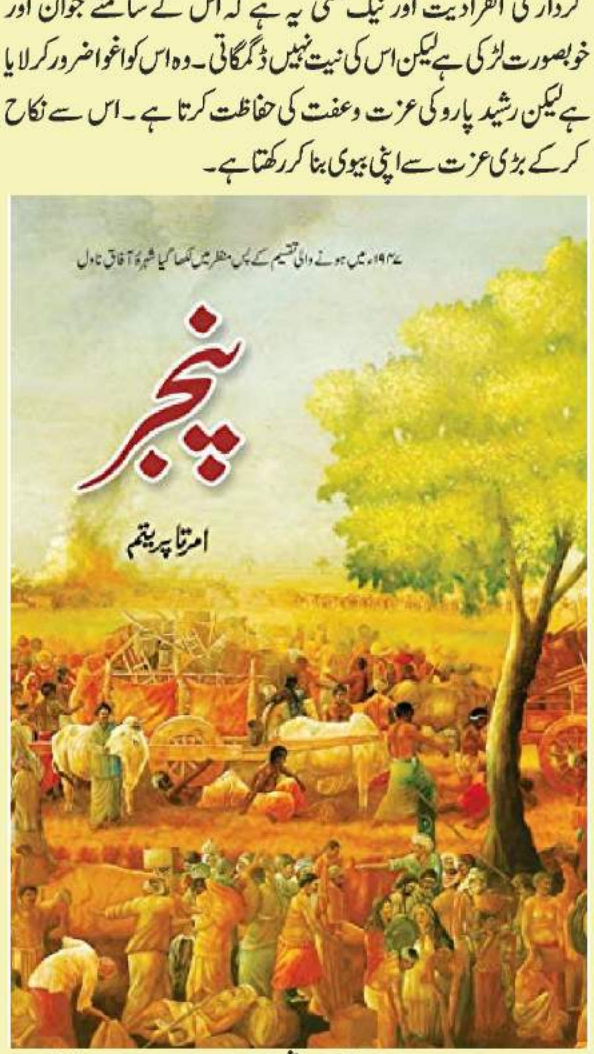

اس ناول میں اصل قصے کے ضمن میں بہت سے چھوٹے قصے اور واقعات بھی سامنے آتے ہیں جس میں موصوفہ نے سماج میں پھیلنے والی برائیوں پر وار کیا ہے۔ جسے پڑھ کر قاری تلملا جاتا ہے اور کف افسوس ملتا ہے۔ مثال کے طور ایک پاگل عورت کا قصہ ہے جو اتنی پاگل ہے کہ اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا ہے بکھرے بال، پھٹی شلوار قمیض، گندی سی، ایک پیالہ کٹورہ ہاتھ میں لیے گاؤں اور کھیت کھلیانوں میں دردر ماری پھرتی ہے۔ مصنفہ نے بڑے موثر اور سلیقے سے سماج کے بھوکے بھیڑیوں کی گندی ہوس پرستی کو اجاگر کیا ہے ایک مرد کس طرح ہوس پرست ہے کہ وہ اپنی جنسی پیاس بجھانے کے لیے ایک پاگل عورت کو بھی نہیں چھوڑتا اور اسے حاملہ کر دیتا ہے۔ بچہ پاگل عورت کے پیٹ میں پلنے لگتا ہے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پاگل عورت بچے کی پیدائش کے وقت تکلیف برداشت نہیں کر پاتی ہے اور وہ مر جاتی ہے۔ اس

کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا بچہ لاورث رہ جاتا ہے۔ یہ بچہ بھی سماج کا'' پنجر'' ہے۔ بچے کو پاروا پنالیتی ہے اوراپنا دودھ پلا کر اسے پالتی ہے۔ یہاں پرممتا کی جو مثال ہے وہ آفاقی اور دائمی ہے۔ بچہ ممتا کے پھول کو اپنے منھ میں لے کر توانا اور تندرست رہتا ہے۔ پھر آگے فرقہ پرست حضرات اس بچے کو اپنی سیاست کا محور بناتے ہیں۔ یہاں بھی مصنفہ نے فرقہ پرست لوگوں کی ذہنیت کو'پنجر' گردان کر موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ایک 'پنجر' زدہ ہندو کہتا ہے پارو ہمارے دیکھتے دیکھتے مسلمان ہماری آنکھوں میں دھول جھونک گئے۔لعنت ہے ہم پر ہندو بچے کو انھوں نے پل بھر میں ہی مسلمان بنالیا۔ پاگل عورت ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ پتہ نہیں وہ ہندو تھی یا مسلمان، کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی لیکن صد افسوس اس بچے پر 'پنجر' زدہ سیاست ہونے لگی۔

تقسیم ہند کے درد سے ہر خاص و عام گزر رہا تھا۔ مصنفہ امرتا پریتم کا تعلق پنجاب سے تھا۔ تقسیم وطن کے اثرات سے پنجاب کیا پورا ہندوستان تھرا اٹھا۔ امرتا پریتم نے اس درد کو بہت قریب سے محسوس کیا، دیکھا اور جھیلا۔ فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی درد کو لے کر ایک ہندو اور مسلمان خاندان کے خاندانوں کا تانا بانا بنا ہے اور موضوع آفاقی ہو گیا۔

''کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں ملتی۔ پھر پارو نے سنا کہ شہروں کی گلیوں میں خون بھر آئی ہیں۔ بازار مردوں سے اٹے پڑے ہیں۔ سڑی ہوئی لاشوں سے بدبو اٹھنے لگی ہے۔ کوئی انھیں جلاتا پھونکتا نہیں۔ کوئی انھیں دفن نہیں کرتا۔ کوئی انھیں سپرد آب نہیں کرتا۔ لوگ کہتے تھے کہ مردوں کی بدبو سے ملک میں بیماری پھیل جائے گی۔''

یہاں بھی فساد ایک 'پنجر' کی مانند اپنا خوفناک چہرہ لیے سب کو ڈرا رہا ہے۔ یہ ایسا دور تھا جب انسان، انسان کا دشمن بن گیا تھا۔ لڑکیوں اور عورتوں کو بے آبرو کیا جا رہا تھا۔ مصنفہ کے حساس دل نے معصوم و بے گناہ لڑکیوں کے درد کو محسوس کیا اور اس درد کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا جو انمٹ ہیں:

ملک تقسیم ہوا۔ بعض شہر سرحد ہو گئے۔ ایک طرف مسلمان رہ گئے۔ دوسری طرف ہندو چلے گئے۔ ہندوستانی پولیس نے گاؤں گاؤں شہر شہر جا کر اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو برآمد کیا۔ موصوفہ نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:

'پولس والوں کی لاری تیار ہو گئی۔ ہندوستانی پولس کے سپاہیوں نے آواز دی۔ آؤ اس طرف (امرتسر) جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں لاری تیار ہے۔ ناول کی ہیروئن پارو بھی یہ اعلان سنتی ہے یہ منظر بڑا کشمکش زدہ ہے۔ پارو کے دل میں بھی خیال آتا ہے وہ چلی جائے۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ اپنے خاوند اور اپنے بیٹے کے پاس چلی جاتی ہے۔ مصنفہ نے پارو کی اس کیفیت اور کشمکش کو بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے جو انتہائی جذباتی ہے:

''اس کو بھی ایک بار خیال آیا اگر میں اس وقت کہہ دوں کہ میں ہندو عورت ہوں تو مجھے بھی وہ اس لاری میں بیٹھا کر ضرور لے جائیں گے۔ میں بھی اپنے دیس ملک واپس جا سکتی ہوں۔ میں بھی لاجو کی طرح— ملک کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح پارو کے رکے ہوئے آنسو پھر امڈ آئے ......اس نے (پارو) اپنے بھائی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور قریب کھڑے ہوئے رشید کے پاس جا کر اپنے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔''

ناول کی انفرادیت اور محور یہ ہے کہ مصنفہ نے عورت کے کردار کو ایثار و قربانی کی دیوی بنا کر پیش کیا ہے۔ پارو میں ایثار و قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جب اس کو رشید اٹھا کر لے جاتا ہے تب سے وہ اپنے ہر عزیز والدین بھائی بہن سب کو یاد کرتی ہے اور ایک عرصے کے بعد ان کے پاس جانے کا موقع ملتا ہے تو وہ رشید کی محبت اور احسان کو نظر انداز نہیں کر پاتی ہے۔ امرتا پریتم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جہاں عورت کو ایثار و قربانی کا مجسمہ بنا کر پیش کیا، وہیں مرد کے کردار کو بھی توانا اور Bold دکھایا ہے۔ رشید اپنے بزرگوں کے کہنے پر پارو کو اغوا تو کر لیتا ہے لیکن زندگی بھر احساس ندامت میں مبتلا رہتا ہے اور اس کے ازالہ کے لیے پارو کو اپنا پیار دیتا ہے اور ہر بات مانتا ہے اور اس کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ رشید اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر پارو کی خوشی کی خاطر ایک ہندو لڑکی کو پناہ دیتا ہے اور اس کو حفاظت سے اس کے رشتہ دار کے حوالے کرتا ہے۔ مصنفہ نے پارو اور رشید کے کردار کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

''رشید کے چہرے پر اس احسان کی خوشی بھی تھی۔ لیکن رشید کی نظریں لاجو کو بچا کر بھی شرمندہ تھیں۔ رشید کو پارو کا اٹھا کر لے آنا یاد آ رہا تھا۔ پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سر کا بوجھ کچھ نہ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔

امرتا پریتم کی تخلیقات میں عورت مختلف روپ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ موصوفہ نے عورت کی نفسیات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جو بار بار پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

Shamsul Hoda Ansari (Alig)
(Chhote Haji Sahab)
Nishat Nagar, Wasseypur
Dhanbad-826001 (Jharkhand)
Mob: 8271638323

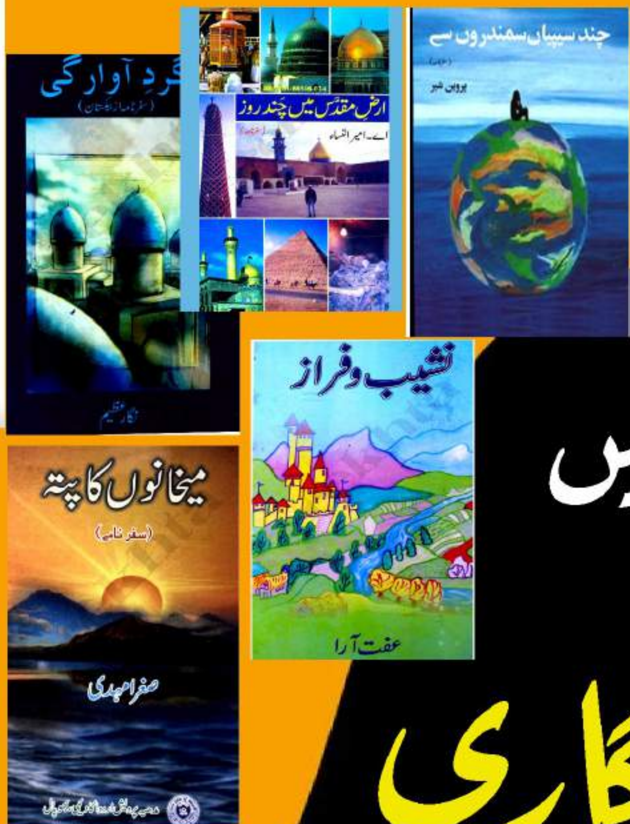

محمد شفیق

رواں صدی میں خواتین کی سفرنامہ نگاری

سفری حالات قلم بند کرنے کی روایت کافی قدیم ہے۔سینکڑوں سال سے ہر زبان میں سفرنامے تحریر کیے جاتے رہے ہیں۔ اردو میں بھی سفرناموں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو ہمہ جہت اور متنوع قسم کی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلاتردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیگر غیر افسانوی اصناف کے مقابلے میں سفرنامہ نگاری کی روایت کافی مستحکم رہی ہے۔لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ابتدائی کئی دہائیوں تک خواتین اس میدان میں کافی پیچھے نظر آتی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک فقط ایک خاتون کے سفرنامے کا ذکر ملتا ہے۔البتہ بیسویں صدی میں خواتین اس صنف کی جانب ضرور متوجہ ہوتی ہیں پھر بھی آزادی تک یہ رفتار سست نظر آتی ہے لیکن آزادی کے بعد اس میں کافی تیزی آتی ہے اور کئی عمدہ سفرنامے منظر عام پر آتے ہیں جو سفرنامہ نگاری کی روایت کو استحکام و رفتار بخشنے میں اہم کردار عطا کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں بھی خواتین اس تابندہ روایت کی امین نظر آتی ہیں جس کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں میں قلم بند کیے گئے خواتین کے سفرناموں کی تعداد تیس سے زائد ہے۔ جس میں سے کئی ایک زبان و بیان، انداز و اسلوب کی سطح پر کافی کامیاب اور عمدہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے چند کا جائزہ ذیل میں پیش ہے:

ارض مقدس میں چند روز

یہ اے۔امیر النساء کا سفرنامہ ہے۔مصنفہ اردو ادب میں ایک فکشن نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔صوبۂ تمل ناڈو سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کا یہ سفرنامہ پہلے ماہنامہ ’انشاء‘ کلکتہ میں قسط وار چھپا۔ بعد میں اسے انشاء کے مدیر ف۔س۔اعجاز نے مرتب کر کے کتابی صورت میں انشاء پبلی کیشنز کلکتہ سے 2002 میں شائع کیا۔اس میں مشرق وسطیٰ کے کئی اہم ممالک اور مقامات مقدسہ کے سفر کے حالات بیان کیے گئے ہیں،جس میں بغداد،کوفہ،کربلا،قاہرہ،مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کی تفصیلات کافی اہم ہیں۔مصنفہ نے ان شہروں کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور تہذیبی قدروں کو رقم کیا ہے۔رسم و رواج کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں کے مزاج اور رویوں کو بھی دلچسپ انداز میں قیدِ تحریر کیا ہے۔امیر النساء نے سلجھے اور دلنشین اسلوب کو اپنایا ہے۔پیرایۂ بیان کی خوبصورتی نے سفرنامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔اردن اور یروشلم کے مابین واقع ایک شہر ’حسین برج‘ کو دیکھ کر وہ اس کی خوبصورتی سے کافی متاثر ہوتی ہیں اور بڑے دل کش پیرائے میں اس کی منظر نگاری کرتی ہیں۔ یہ دلچسپ بیان انھیں کی زبانی سنیں:

”اردن اور یروشلم کے درمیان ایک برج ہے جو حسین برج کہلاتا ہے۔کافی اونچائی پر بسا ہوا یہ شہر بڑا خوبصورت نظارہ

پیش کررہا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر بل کھاتی ہوئی چکنی سڑکیں ،نشیب وفراز پر موڑ مڑتی ہوئی تیز رفتار سواریاں ،یوکلپٹس کے پیڑ سڑکوں سے متصل ،دورویہ کھیتوں کا سلسلہ، کہیں جدید قسم کے ٹریکٹر سے ہل چلوایا جارہا ہے، کہیں خچر یہ کام انجام دے رہے ہیں ۔حد نظر تک ہریالی ہے ،لہلہاتے ہوئے ساگ کے پتے، کہیں سبزیوں کے پتے، کہیں سبزیوں کے پودے، تو کہیں پھلوں کے درخت، ان میں نمایاں انگور کی بیلیں ہیں جن میں بڑے دانوں والے سیاہ انگور کے خوشے جھول رہے ہیں۔“

(ارض مقدس میں چندروز، اے امیر النساء، انشاء پبلی کیشنز،کلکتہ،2001،ص:49)

یہ سفرنامہ مختصر ہے، اتنا کہ اس کی وجہ سے کہیں کہیں قاری کوتشنہ لبی کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ مثلاً مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کی روداد کو مزید وضاحت سے قلم بند کرتیں تو دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا۔ انبیاء، صحابہ اور صلحاء کے سوانحی کوائف اوران کے مزارات کی تفصیل کے بجائے اپنے ذاتی مشاہدات وتاثرات کو بیان کرتیں تو سفرنامہ اور کامیاب ہوتا۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنفہ اپنے موثر انداز واسلوب کی وجہ سے قاری کو اپنا شریکِ سفر بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔

میخانوں کا پتہ

یہ اردو کی مشہور قلم کار صغریٰ مہدی کے سفرناموں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے پہلی بار 2005 میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا۔ اس سے پہلے ان کا سفرنامہ ’سیر کر غافل دنیا کی‘ شائع ہوکر مقبول ہو چکا تھا۔ ’میخانوں کا پتہ‘ میں مصنفہ نے پانچ عنوانات کے تحت اپنے پانچ اسفار کے احوال بیان کیے ہیں ۔ جن میں مکہ ، مدینہ ،عراق، ایران ، شام ، جاپان ، بینکاک ، امریکہ، لندن اور اسپین کے شہروں کے واقعات و مشاہدات اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ پیش کش کا انداز دلچسپ ہے، موقع ومحل کے اعتبار سے اشعار کا استعمال بھی پایا جاتا ہے اور زبان میں بے ساختگی بھی۔:

”مسجد اور اس کے اطراف ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ رنگ برنگی چادروں میں عورتیں ، بچے، آئس کریم ، طرح طرح کے شربت ، کھلونے ،مسجد کے اندر بھی بھیڑ تھی ۔ میں تو اندر جانے کی ہمت ہار رہی تھی ،مگر ہماری ایک نہایت ایکٹیو ساتھی مجھے ساتھ لے گئیں ۔ وہاں تو کندھے سے کندھا چھل رہا تھا، ایسی حالت میں جیسے تیسے نماز پڑھی ، دعا مانگی اوران کو وہاں چھوڑ کر میں باہر بھاگی ۔ جوتے بغل میں تھے ، باہر نکلی تو پیچھے سے ایک چھڑی پڑی ، پیچھے مڑکر دیکھا تو ایک مجاور سر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو دھکم پیل میں کھل گیا تھا۔ جلدی سے اوڑھا اور ایک طرف آکر بیٹھ کر ساتھیوں کا انتظار کرنے لگی۔“

(میخانوں کا پتہ، صغریٰ مہدی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال2005،ص31)

مذکورہ عبارت میں صغریٰ مہدی نے ایران کے سرحدی شہر مکران کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی روداد بیان کی ہے۔ واقعہ عام سا ہے لیکن فن کار کے اندازِ بیان اور بے ساختہ پن نے اسے دلچسپ بنا دیا ہے ۔سفرنامے کی خالق بنیادی طور سے فکشن نگار تھیں، اس لیے ان کے سفرناموں میں کہیں کہیں افسانوی رنگ غالب آجاتا ہے ۔ یہ رنگ اکثر خواتین کے سفرناموں میں پایا جاتا ہے ۔ کچھ ہنرمند فنکار خواتین کمالِ احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے افسانوی انداز اپناتی ہیں اور دبے قدموں سے سفرنامے کی طرف لوٹ بھی آتی ہیں جس سے ان کا یہ انداز حسن کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور کچھ خواتین افسانوی تصورات میں ایسے کھو جاتی ہیں کہ سفرنامے کا فن مجروح ہونے لگتا ہے ۔ صغریٰ مہدی کے ساتھ بھی اس سفرنامے میں کئی مقام پر ایسا ہی ہوا۔

گرد آوارگی

مشہور فکشن رائٹر نگار عظیم کا ضخیم سفرنامہ ہے۔ نگار عظیم نے یہ سفر مشہور نقاد قمر رئیس کی ایماء پر کیا تھا۔ ازبکستان کے اس سفر میں ان کے شوہر عبدالعظیم بھی ساتھ تھے۔ نگار نے ازبکستان کے قدرتی حسن ،مہمان نوازی ،تاریخی عمارات کو قریب سے دیکھا اور وہاں کی ادبی تقریبات میں شمولیت کا تجربہ بھی کیا۔ ان تمام حالات کو انھوں نے 48 عنوانات کے تحت اس سفرنامے میں پیش کیا ہے۔ اس کی اشاعت 2006 میں ہوئی۔ نگار عظیم اگرچہ بنیادی طور سے ایک افسانہ نگار ہیں لیکن سفرنامے میں انھوں نے افسانوی انداز سے گریز کرتے ہوئے سادہ اور عام فہم اسلوب کو اپنایا ہے اور دلچسپ پیرایے میں اپنے مشاہدات وتاثرات کو قید تحریر کیا ہے۔ تاشقند کی ایک سڑک کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں:

”گاڑی ائیر پورٹ سے نکل کر فراٹے بھرتی ہوئی سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تاشقند سڑکوں پر نہیں دلوں میں بستا ہے۔ کشادہ چوڑی کھلی سڑکیں، صاف ستھری چمکدار، دونوں طرف گھنے اونچے چنار کے درخت، قطار در قطار پھل دار درخت جن کی خوشبوؤں سے ہوا معطر ہو رہی تھی

۔وہی آسمان تھا جو مجھے اپنی سرزمین سے نظر آتا تھا لیکن وہاں سے زیادہ شفاف اور نیلا۔۔۔ دھوپ بھی وہی تھی جو میرے ملک کی بالیوں کو سنہرا کرتی تھی لیکن اتنی خوشنما اور کھلتی ہوئی دھوپ تو پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔جسم کا انگ انگ نہ صرف نرم ہو گیا تھا بلکہ کھل اٹھا تھا۔''

(گردِ آوارگی، نگار عظیم، خود مصنفہ 2006، ص:9)

محسوس کیا جا سکتا ہے کہ سفرنامہ نگار نے ایک سنسان سڑک کا جس انداز سے نقشہ کھینچا ہے وہ اس کے زبان و بیان پر قدرت کا غماز ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مصنفہ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے اور انھیں الفاظ کا جامہ عطا کر قاری کو شریکِ سفر بنانے کا ہنر بھی خوب رکھتی ہیں۔ وہاں کے آسمان اور دھوپ کا اپنے ملک کے آسمان اور دھوپ سے موازنہ کرنا قاری کو چونکاتا بھی ہے اور ان کی فرحت کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ موازنہ پورے سفرنامے میں پایا جاتا ہے جو کہ ایک فطری بات ہے۔

دیکھا ہم نے استنبول

یہ لکھنؤ کی معروف ادیبہ صبیحہ انور کا سفرنامہ ہے۔ صبیحہ انور کو اپنے افسانہ نگاری کی شناخت پر اصرار ہے لیکن ادبی دنیا میں ان کی وجہِ شہرت ان کی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح حیات'' ہے۔ گویا کہ وہ ایک ناقد کے بطور بھی اپنی شناخت مستحکم کر چکی ہیں۔ انھوں نے 2010 میں اپنے شوہر اور بیٹے کے ہمراہ استنبول کا دس روزہ دورہ کیا۔ سفر کی یہ روداد 2013 میں 'دیکھا ہم نے استنبول' کے نام سے شائع ہوئی۔ سفرنامے میں انھوں نے استنبول کے آٹھ قابل دید مقامات کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی وہاں کی تہذیبی و ثقافتی انفراد، اعلیٰ اخلاقی قدریں، گرم جوش مہمان نوازی، سنگ مرمر سے سجی مسجدیں، کشادہ و شفاف سڑکیں، اعلیٰ معیاری حمام، تاریخی یادگار کو سنجوئے میوزیم اور دلفریب باغات کے حسن کا بیان دلچسپ پیرایے میں اور اپنے مخصوص لب و لہجے میں کیا ہے۔ 'پیش لفظ' میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''استنبول کے ایوانوں، عجائب خانوں، گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہوئے مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ ان چند دنوں میں ایک ایک لمحہ میرے لیے استعجاب، خوشی اور کسک کی ایک بے پایاں دولت کا تجربہ ثابت ہوگا۔ ان سارے احساسات کو کاغذ پر منتقل کرنے بیٹھی تو اندازہ ہوا کہ یہ سیاحت خود کو دریافت کرنے کا ایک وسیلہ بھی تھی۔ ان ساری یادوں کو سمیٹنا کہیں کہیں بس سے باہر اور کسی قدر غیر ضروری بھی معلوم ہونے لگا۔''

(ہم نے دیکھا استنبول، صبیحہ انور، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی 2013، ص:10)

فن کار نے اپنے جذبات و احساسات کو بڑی خوبصورتی سے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ برمحل اشعار کا استعمال بھی خوب کیا ہے، اس سے سفرنامے کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ سفرنامہ نگار وہاں پہنچ کر اپنے شہر لکھنؤ کو قدم قدم پر یاد کرتی ہیں اور جگہ جگہ وہاں کی عمارات کا موازنہ لکھنؤ کے تاریخی مقامات سے کرتی ہیں۔ یہ سفرنامہ زبان و بیان، منظر نگاری، تاریخی معلومات اور مشاہدے کی گہرائی کے اعتبار سے ایک کامیاب کوشش ہے اور اکیسویں صدی کے سفرناموں میں وقیع اضافہ ہے۔

چند سیپیاں سمندروں سے

یہ، بہار سے تعلق رکھنے والی مقیم حال کینیڈا، پروین شیر کا سفرنامہ ہے۔ اس کی اشاعت 2014 میں ہوئی۔ پروین شیر نے عصر حاضر میں بیک وقت ایک کامیاب شاعرہ اور مصورہ کی حیثیت سے اپنے وجود کو منوایا ہے۔ اس سفرنامے کی اشاعت کے ساتھ ہی وہ اردو دنیا میں ایک سفرنامہ نگار کے طور پر بھی اپنا تشخص قائم کر چکی ہیں۔ سفرنامہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 'سیاہ روشنی' کے نام سے ہے، اس میں جنوبی افریقہ کے سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ ''طلسمی جہاں'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ساؤتھ امریکہ کے سفر کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس سفرنامے کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ یہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی ضخامت کافی بڑھ گئی ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا کہ پروین شیر ایک کامیاب مصورہ بھی ہیں، اس کی واضح جھلک اس پورے سفرنامے میں پائی جاتی ہے اور قاری کو تحریر کے ساتھ ساتھ ان کی مصوری سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ سفرنامہ کافی کامیاب ہے۔ واقعات نگاری پر اکتفا کرنے کے بجائے تخلیقی ہنرمندیوں کو بروئے کار لایا گیا ہے اور بیانیہ انداز کو ترجیح دی گئی ہے۔ عام مناظر کے بیان میں ایسے نکات کا ذکر کیا گیا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ مثلاً موم بتی کی فیکٹری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''خوبصورت Ezulwini Velley میں سوآزی لینڈ کی دنیا میں مشہور موم بتی کی فیکٹری ہے۔ جہاں پہنچ کر محسوس ہوا تھا جیسے یہ موم کا جہاں ہو۔ ہر طرف عورتیں اور مرد اپنی فنکاری میں مصروف تھے۔ ہر طرف موم کسی اور شکل میں ڈھل رہے

تھے۔ افریقن حیوانات کی شکل کی موم بتیاں ہاتھوں سے منٹوں میں تیار ہو رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے موم کا ٹکڑا نئی شکل پا رہا تھا۔ موم بتی بنانے والوں کے ہاتھوں میں جیسے جادو تھا۔ ہزاروں چھوٹی بڑی رنگ برنگی موم بتیاں افریقن جانور بنی سجی ہوئی تھیں جو برائے فروخت تھیں۔ تین وسیع کمروں میں انسانی انگلیاں مشین بنی ہوئی تھیں۔ سیاح جس جانور کو چاہتے اس کی شکل کی موم بتی بنوا رہے تھے جو صرف پانچ منٹ میں تیار ہو جاتی تھی۔ وہ موم بتی کی زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ روشنی دینے کے لیے جان دے دیتی ہے۔ ماں کی طرح۔ جو ساری عمر اپنے گھر میں خوشیوں کا اجالا قائم رکھنے کے لیے خود کو فنا کر دیتی ہے۔ موم بتی کی طرح جلتے جلتے خود پگھل جاتی ہے۔ اپنا وجود کھو دیتی ہے۔
موم بتیاں اور مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بے غرض۔ صرف دینے والی۔''

(چند سیپیاں سمندروں سے، پروین شیر، پرنس آرٹس پرنٹرس دہلی 2014، ص 99-100)

بیانیے کے اس انداز کے مشاہدے کے بعد قاری کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ سفرنامہ نگار، تخلیقی تجربے کی گہرائی اور تخیل کی پرواز کے سہارے ایک عام منظر کو بھی قابل دید و شنید بنا کر پیش کرنے کا ہنر رکھتی ہیں اور ساتھ ہی ایک حساس دل بھی۔ بلاشبہ یہ سفرنامہ عام روایت سے ہٹ کر تحریر کیا گیا ہے اور ایک کردار کی زبانی رودادِ سفر کو بیان کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے جو کہ ایک منفرد اور کامیاب کوشش ہے۔

خوابوں کا جزیرہ

یہ دردانہ قاسمی کا سفرنامہ ہے۔ موصوفہ، اردو کے مشہور نقاد ابوالکلام قاسمی کی اہلیہ اور کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ 2011 میں اپنے شوہر کے ساتھ ماریشس کا سفر کیا اور اس سفر کے حالات کو روزنامچہ کی شکل میں قلم بند کرنے کا اہتمام کیا، 2014ء میں اسے 'خوابوں کا جزیرہ' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اس سفرنامے میں انھوں نے قلب ونظر کو تازگی عطا کرنے والے مناظر کی منفرد ترجمانی کی ہے۔ موثر زبان و بیان کے تعاون سے اس سفر کی حسین کیفیات و واردات میں قاری کو شریک کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ اس سفرنامے کی ایک اہم خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کی حیثیت نہ ہی آزادی سے قبل لکھے گئے سفرناموں کی طرح احساسات سے عاری محض گائڈ کی ہے اور نہ ہی عصر حاضر میں لکھے جا رہے اکثر سفرناموں کی طرح ہے، جس میں محض کیفیات و واردات کا

بیان ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں معتدل و منفرد طریق کار اپنایا گیا ہے اور دونوں کے حسین امتزاج کی عمدہ مثال پیش کی گئی ہے۔ ماریشس کی آبادی کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''اس وقت ماریشس کی 12 لاکھ آبادی میں اندازاً 68 فیصد ہندوستانی نسل کے لوگ ہیں۔ 51 فیصد ہندو ہیں، 17 فیصد مسلمان ہیں، 25 فیصد عیسائی ہیں اور باقی بدھ مت اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے۔ سر دست ماریشس میں ہندوستانی گجراتی، تمل، مراٹھی ہیں وہ قدرے بعد میں پہنچے تھے۔ عیسائیوں کے علاوہ چینی اور بدھسٹ لوگ بھی وقت کے ساتھ ساتھ ماریشس کی آبادی کا حصہ بن گئے ہیں۔''

(خوابوں کا جزیرہ، دردانہ قاسمی، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ 2014، ص 18)

اس سفرنامے میں مارشس سے متعلق پیش کردہ روداد کے ذریعہ یہاں کے احوال و آثار، تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور یہاں کی مہمان نوازی و ادب نوازی وغیرہ بہت سی باتوں سے قاری کو واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی 'خوابوں کا جزیرہ' معلومات اور جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ فکر وفن کے اعتبار سے ایک کامیاب سفرنامہ ہے جس میں دردانہ قاسمی نے اپنے احساسات و واردات کو بڑی ایمانداری اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے انداز

یہ نگہت پروین صاحبہ کے اسفار کا مجموعہ ہے۔ مصنفہ کا تعلق لکھنؤ کے ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ خود بھی تعلیم یافتہ اور دین کی مبلغہ ہیں۔ 2000 میں انھوں نے اپنے برادران اور اہل خاندان کے ساتھ دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کیا اور واپسی کے بعد سفر کے حالات و تاثرات کو قلم بند کیا۔ جس کی اشاعت 2010 میں رابع حسن ندوی کے مقدمے کے ساتھ ہوئی۔ یہ سفرنامہ تین ابواب اور سو سے زائد عنوانات پر مشتمل ہے۔ پہلا باب مشرق وسطیٰ کے ممالک: جارڈن، عراق، فلسطین، اور مصر و شام کی سیاحت و زیارت سے متعلق ہے۔ جب کہ دوسرا باب دیار شوق ملک عرب کے یادگار ایام کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں حرمین شریفین میں ماہ رمضان میں قیام کرنے اور عمرہ و طواف کی سعادت اختیار کرنے اور رمضان کے مہینے میں وہاں کی روحانیت اور نورانیت سے مستفیض ہونے اور مکہ مکرمہ میں عید مبارک کرنے کا بیان دلکش اسلوب اور پرکشش انداز میں ہے۔ تیسرے باب میں یورپی ممالک انگلینڈ، فرانس، جرمن، سوئٹزر لینڈ اور اسپین کی رودادِ سفر تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ مصنفہ کا تعلق چونکہ

ادبی دنیا سے نہیں رہا ہے اس لیے ان کا یہ سفرنامہ اہل ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا حالانکہ اکیسویں صدی میں تحریر کیے گئے خواتین کے سفرناموں میں یہ جگہ پانے کا مستحق ہے۔

نشیب و فراز

عفت آرا کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ یہ اردو کے اہم ناقد اسلوب احمد انصاری کی بیٹی ہیں۔ بنیادی طور سے یہ ایک کہانی کار ہیں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''زندگی کے رنگ'' کے عنوان سے 2001 میں شائع ہو چکا ہے۔ 2014 میں ان کی ایک ضخیم کتاب 'نشیب و فراز' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ کسی ایک مخصوص موضوع پر نہیں ہے بلکہ مختلف اصناف کے تحت قلم بند کی گئی ان کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ شروع کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر ان کے کئی سفرنامے بکھرے ہوئے ہیں جس میں جزیرہ انڈمان نکوبار، چنڈی گڑھ، کالپی، اترانچل، گورکھپور، آگرہ، راجستھان، اتراکھنڈ، کانپور، حیدرآباد، بھوپال، ہماچل پردیش اور کنیا کماری کے سفر کی مختصر روداد بیان کی گئی ہے۔ مصنفہ کو جہاں بھی جانے اور گھومنے کا اتفاق ہوا اس جگہ کو انھوں نے ایک سیاح کی طرح بڑے قریب اور غور سے دیکھنے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ اپنے تاثرات و مشاہدات کو فوراً قلم بند کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ یہ سفرنامے اگرچہ مختصر ہیں لیکن معلومات اور انداز پیش کش کے لحاظ سے اہم اور دلچسپ ہیں۔ مصنفہ کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے۔ مناظر کی عکاسی بھی پرکشش طریقے سے کی ہے۔ ذیل کی عبارت سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ لکھتی ہیں:

> ''انڈمان اور نکوبار کے جزیروں میں قدم رکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے خلیج بنگال کے درمیان ایک جنت اس سرزمین پر بنائی ہے جہاں فطرت کی کاری گری اپنی تمام رعنائی کا اظہار کر رہی ہے۔ دور دور تک پھیلا ہوا سمندر جس میں گہرا نیلا، ہرا اور سفید پانی یوں متواتر اور نہایت محویت کے ساتھ تیز لہروں کی صورت میں بہتا ہے اور ایک مدھم ساز پیدا کرتا ہے کہ اس نظارے سے آنکھیں سیراب ہوتی ہیں اور واقعی تا حد نگاہ آب ہی آب ہے۔ وہاں کورل باغوں کی طرح آگے نظر آتے ہیں۔ سورج کی تمازت سے پانی اور ساحل سمندر زریں معلوم ہوتے ہیں۔ جزیروں پر گھنے اور شاداب تر و تازہ درختوں کے جنگل ہیں اور یہ تمام فطرت کے شاہکار مہم جو اور شوقین سیاحوں کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں۔''

(نشیب و فراز، عفت آرا، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، 2014، ص:15)

مذکورہ سفرناموں کے علاوہ اکیسویں صدی میں تحریر کیے گئے خواتین کے سفرناموں میں جن تخلیقات نے قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی پائی، ان میں: سحاب قزلباش کا 'ملکوں ملکوں شہروں شہروں' زہرہ بتول کا 'سفرنامہ حجاز و ایران' نعیم فاطمہ علوی کا 'دیار گنگ و جمن میں' زینت مسعود کا 'عراق کا سفرنامہ'' مرضیہ عارف کا 'مشاہدہ حرم' فہمیدہ ریاض کا 'گوداوری' شگفتہ یاسمین کا 'سب ورق تیری یاد کے' قابل ذکر ہیں اور خواتین سفرنامہ نگاروں میں سرحد پار سے سلمیٰ اعوان اور قرۃ العین طاہرہ سر فہرست ہیں۔

اس مختصر مطالعے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماقبل صدی کے مقابلے میں موجودہ صدی، خواتین کے لیے کافی سازگار ثابت ہو رہی ہے۔ انھوں نے دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ فنِ سفرنامہ نگاری میں بھی اپنی بھرپور موجودگی درج کرائی ہے اور کئی عمدہ سفرنامے اردو قارئین کو دے کر نہ صرف اس صنف کے دامن کو وسعت دی ہے بلکہ اس باب میں اپنی اہمیت اور مرتبے کے تعین کو بھی یقینی بنایا ہے۔ ان سفرناموں کے مطالعے کے بعد یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس میں خواتین نے نسائی احساسات و روایات کو سمو دیا ہے جسے ایک عورت کی نظر سے دنیا کو دیکھ کر پھر اسے بھرپور انداز سے دکھانے کی کامیاب کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اکیسویں صدی کی خواتین سفرنامہ نگاروں نے بدلتے منظر نامے کے پیش نظر جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے، اسلوب و بیان کی سطح پر جدت و تنوع کو نہ صرف برتا ہے بلکہ ان کی فنی جہات میں اضافہ بھی کیا ہے اور معلومات اور واقعات سے زیادہ محسوساتِ روحانی اور وارداتِ قلبی پر توجہ دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فکشن کے عناصر کی آمیزش نے منظر نگاری اور جذبات نگاری کے تاثر کو مزید بڑھا دیا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر مستقبل میں اس روایت کی تابناکی کے آثار واضح نظر آتے ہیں۔

□□□

MOHAMMAD SHAFIQUE
Research Scholar (Urdu)
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus.
504/122, Tagore Marg, Near Shabab
Market, Daliganj, Lucknow-226020 (U.P)
Mob. 7417824925
shafiqalig12@gmail.com

ڈاکٹر حسینہ خانم

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا جائزہ

اردو ادب میں افسانے نے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک نئی صنف سخن کی حیثیت سے آنکھ کھولی اور اس کی طفولیت کے زمانے ہی میں ہندوستان سیاسی، معاشی اور معاشرتی انتشار و خلفشار کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس کی ترجمانی اس وقت کے اولین فکشن نگاروں کے یہاں نظر آتی ہے جن میں سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری اور حجاب امتیاز علی وغیرہ کے نام ان کے بعد آنے والوں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد افسانے کی ہیئت، موضوع اور اسلوب میں مغرب کے اثرات سے واضح تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ افسانے کے ابتدائی دور سے لے کر اس کے عہد شباب کو پہنچنے تک کچھ افسانہ نگاروں نے اپنی افتادِ طبع سے اس میں نت نئے گل بوٹے کھلائے اور اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ ان افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، اپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ اہم ہیں۔

1936 سے 1947 تک کا وہ زمانہ جو ایک طرف تو اردو ادب میں ترقی پسندوں کے عروج کا زمانہ تھا اور دوسری طرف ہندوستان ایک بڑے سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ لہٰذا اس وقت کے حالات و واقعات کو ضبطِ تحریر میں لانے والے فکشن نگاروں میں نئی نسل میں غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، دیویندر سیتارتھی، بلونت سنگھ، ابراہیم جلیس، حسن عسکری، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شفیق الرحمٰن، تسنیم سلیم چھتاری اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ستاروں سے آگے:

قرۃ العین حیدر کا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' 1947 میں منظرِ عام پر آیا[1] اور پاکستان میں پہلی بار 1979 میں ''ادب لاہور'' نے شائع کیا۔

اس ضمن میں عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

> ''میرے بھی صنم خانے کی تحریر سے ایک سال قبل 1946 میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' شائع ہو چکا تھا۔ عنوانِ کتاب سے بجا طور پر ایک مثالیت پسندی اور اس کی تمام خواب ناکیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اقبال نے غزل کا یہ شعر اپنی مخصوص حکیمانہ فکر کے تحت اپنے وقت کی انسانیت کو اولوالعزمی کا ایک پیغام دینے کے لیے کہا تھا۔ مگر قرۃ العین حیدر کی نوجوان نسل نے تقسیم ہند سے قبل کے ہندوستانی ماحول میں اسے اپنی رومان پسندی کی ایک علامت بنا لیا اور گویا ایک خاص قسم کی ترقی پسندی کا نشان سمجھا۔'' [2]

''ستاروں سے آگے'' میں قرۃ العین حیدر کی تحریروں کے ابتدائی نقوش ہیں۔ یہ مجموعہ کل چودہ افسانوں پر مشتمل ہے جس کی ترتیب اس طرح ہے۔ ''دیوار کے درخت''، ''پرواز کے بعد''، ''سنا ہے عالم بالا میں

کوئی کیمیا گر تھا"، "ٹوٹتے تارے"، "لیکن گومتی بہتی رہی"، "ستاروں سے آگے"، "آہ! اے دوست"، "ایں دفتر بے معنیٰ....."، "ہم لوگ"، "رقص شرر"، "یہ باتیں"، "اودھ کی شام"، "مونالیسا" اور "جہاں کارواں ٹھہرا تھا"۔

شیشے کے گھر:

ستاروں سے آگے کے بعد شائع ہونے والا قرۃ العین حیدر کا دوسرا افسانوی مجموعہ "شیشے کے گھر" پہلی مرتبہ ستمبر 1945 میں 3؎ اور دوسری بار جنوری 1956 میں رشید چودھری مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔ دوسری کتابوں کے عنوان کی طرح اس مجموعے کا عنوان بھی علامتی ہے۔ 447 صفحات پر مبنی وسیع و عریض "شیشے کے گھر" میں بارہ مختلف قسم کے افسانوں کو یکجا کیا ہے۔ جو اس طرح ہیں: "جب طوفان گذر چکا"، "سر راہے"، "آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا"، "میں نے لاکھوں کے بول سہے"، "برف باری سے پہلے"، "کیکٹس لینڈ"، "یہ داغ داغ اجالا"، "جہاں پھول کھلتے تھے"، "دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم"، "انت بھئے رُت بسنت میرو" اور "لندن لیٹر اور جلاوطن"۔

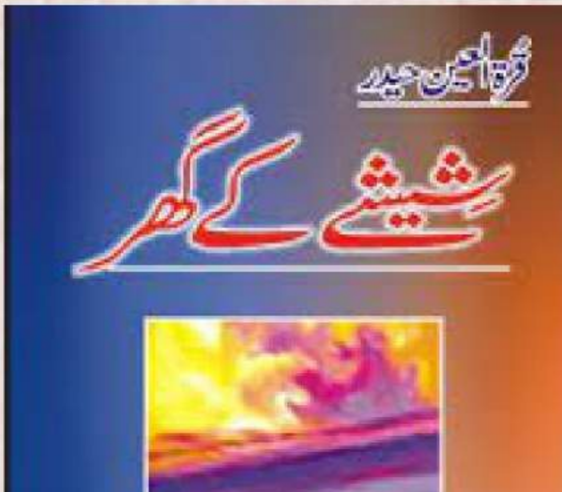

جب طوفان گذر چکا، قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعہ "شیشے کے گھر" کا پہلا افسانہ ہے۔ جو 1947 میں ساقی کے سال نامہ میں شائع ہوا۔ 1950 میں قرۃ العین حیدر نے "کیکٹس لینڈ" کے عنوان سے ایک افسانہ تحریر کیا جسے محمود ہاشمی نے "شیشے کے گھر" کا سب سے اہم اردو افسانہ قرار دیا ہے۔ ان کے قول کے مطابق قرۃ العین حیدر کے کیکٹس لینڈ کو جدید اردو افسانے کی تاریخ میں وہی اہمیت حاصل ہے جو جدید انگریزی شاعری میں ایلیٹ کی تخلیق 'ویسٹ لینڈ' کو ہے۔ افسانہ "جہاں پھول کھلتے ہیں" میں قرۃ العین حیدر نے اپنے والد کی موت سے پیدا شدہ جذبات و کیفیات کا بیان کیا ہے۔ اسے افسانوی مرثیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ جلاوطن اس مجموعے میں شامل سب سے آخری اور مشہور افسانہ ہے جس کی شہرت اور پسندیدگی کے سبب اسے بہترین افسانہ اور عظیم کہانی کا نام دیا گیا۔

افسانہ "جلاوطن"، "شیشے کے گھر" اور "پت جھڑ کی آواز" دونوں مجموعوں میں شامل ہے۔ یہ ہندو مسلم بھائی چارگی اور آپسی میل جول کی کہانی ہے۔ 1947 کے بعد جو لوگ پاکستان نہیں گئے وہ اپنے ہی وطن میں کس طرح جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں مذکورہ افسانے میں یہ دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔

پت جھڑ کی آواز:

'پت جھڑ کی آواز' قرۃ العین حیدر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو دسمبر 1965 میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعے میں صرف آٹھ افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے "ڈالن والا"، "جلاوطن"، "یاد کی ایک دھنک جلے"، "قلندر"، "کارمن"، "ایک مکالمہ"، "پت جھڑ کی آواز" اور "ہاؤسنگ سوسائٹی" ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے اہم افسانہ "پت جھڑ کی آواز" ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں 1947 کے بعد دلّی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اس کی ہو بہو تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ آٹھواں اور آخری افسانہ ہاؤسنگ سوسائٹی ان طویل افسانوں میں سے ہے جن میں آزادی سے قبل کے ہندوستان کی تصویر اور تقسیم کے بعد پاکستان کی نئی معاشرت اور معیشت کی جھلکیوں کے ساتھ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کی جیتی جاگتی کردار کشی کی گئی ہے۔ 336 صفحات پر اس مجموعے کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔

روشنی کی رفتار:

قرۃ العین حیدر کا چوتھا افسانوی مجموعہ "روشنی کی رفتار" ہے۔ اس نام سے ان کا ایک افسانہ بھی اسی مجموعے میں شامل ہے۔ اسے ایجوکیشنل بک ہاؤس نے 1982 میں پہلی بار شائع کیا۔ 4؎ اس مجموعے میں سب سے زیادہ افسانے شامل ہیں۔ ان کی کل تعداد اٹھارہ (18) ہے۔ یہ افسانے "آوارہ گرد"، "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی"، "فوٹو گرافر"، "حسب نسب"،

''سکریٹری''، ''نظارہ درمیاں ہے''، ''دوسیاح''، ''یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے''، ''فقیروں کی پہاڑی''، ''اکثر اس طرح بھی رقص فغاں ہوتا ہے''، ''سینٹ فلور آف جارجیا کے اعتراف''، ''روشنی کی رفتار''، ''لکڑ بگھے کی ہنسی''، ''آئینہ فروش شہر کوراں''، ''پالی ہل کی ایک رات''، ''دریں گرد سوارے باشد''، ''جن بولو تارا تارا'' اور ''کہرے کے پیچھے'' ہیں۔

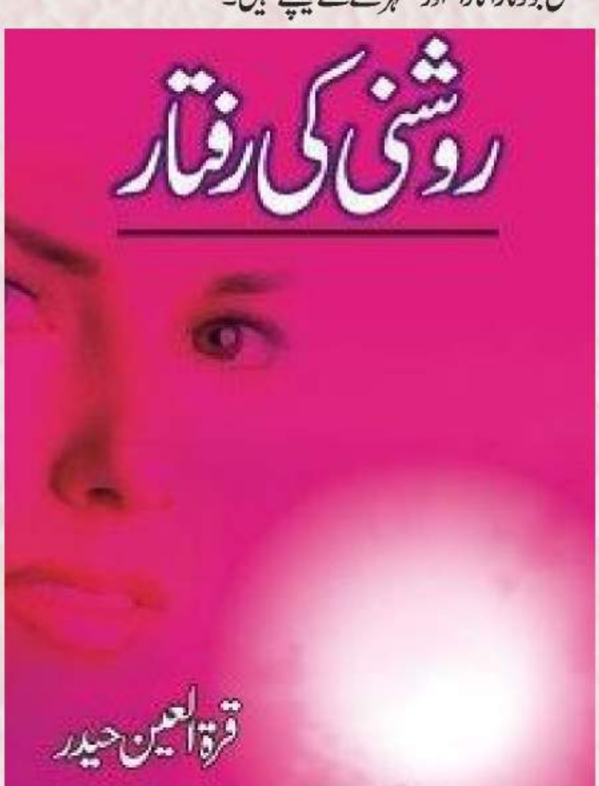

336 صفحات پر مشتمل اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''آوارہ گرد'' اپنے آپ میں افسانویت کو پورے طور پر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ افسانہ 1945 کے بعد یورپ کی نوجوان نسل کے ایک فرد کا پر درد المیہ بیان کرتا ہے۔ زندگی کا تجربہ کرنے کے لیے یہ نوجوان دنیا کے سفر پر نکلتا ہے اور آخر کار ویت نام میں اتفاقیہ گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ افسانہ عالمی سطح پر قرۃ العین حیدر کی انسانی ہمدردی کا ثبوت پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''نظارہ درمیاں ہے'' یہ افسانہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی ایک غریب مغنّیہ لڑکی سے محبت کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح محبت میں لڑکے کی طرف سے عدم توجہی برتنے اور شادی کر لینے سے وہ لڑکی ٹوٹ جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ اپنی زندگی ہار جاتی ہے۔

''یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے'' یہ بھی دو لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والی محبت کی لرزہ خیز داستان ہے۔ جو ایک فلسطینی دہشت گرد اور ایک روسی مہاجر لڑکی سے وابستہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر زندگی کو پر مسرت انداز میں جیتے ہیں۔ فلسطینی دہشت گرد اپنی محبوبہ کے سامنے اپنی زندگی کے اوراق کھولتا ہے اور اسے اپنی دہشت گردی کی کہانی سناتا ہے۔ کتاب کے آخری اوراق کے ساتھ اس کی زندگی کی کتاب بھی بند ہو جاتی ہے۔ وہ بم داغتے ہوئے مارا جاتا ہے اور اپنے مقصد کی تکمیل میں اپنی زندگی ہار جاتا ہے۔ اپنی دہشت پسند زندگی میں جو چند گھڑیاں وہ محبت کے آغوش میں گزارتا ہے اس کے بعد وہ بخوشی موت کو قبول کر لیتا ہے۔ مختار شمیم نے قرۃ العین حیدر کے اس فن پارے کو 1975 کا شاہکار قرار دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو کی مایہ ناز ہستیوں میں ایک ہیں۔ فکشن نگاری میں ان کا شمار چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی افسانہ نگار تھیں جنھوں نے خواتین افسانہ نگار بلکہ مرد فکشن نگار کی طرف سے الگ اپنے فکشن کی بنیاد رکھی۔ اپنے فکشن کے ذریعہ انھوں نے اردو ادب میں بیش بہا لعل و گہر ٹانکے۔ اردو ادب میں ان کی خدمات کے حوالے سے بحث کی جائے تو ان کا دائرہ کافی وسیع نظر آتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو نہ صرف اپنے فکشن سے نوازا بلکہ انھوں نے رپورتاژ، تراجم اور بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں۔ بعد ازاں اپنے اردو ناولوں کے انگریزی ترجمے، اردو میں انگنت مضامین، انگریزی میں مضامین اور 38 عظیم ہستیوں پر خاکے بھی لکھے۔ نند کشور وکرم نے اپنے مضمون ''احوال کوائف'' ۵ میں قرۃ العین حیدر کی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور قرۃ العین حیدر کی تمام تر تخلیقات اور مطبوعات کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

☆ افسانوی مجموعے:

1۔ ستاروں سے آگے	:	1947
2۔ شیشے کے گھر	:	مکتبہ جدید لاہور، 1954
3۔ پت جھڑ کی آواز	:	مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1967
4۔ روشنی کی رفتار	:	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1982
5۔ جگنوؤں کی دنیا	:	انجمن ترقی اردو ہند، 1990

ڈاکٹر جمیل اختر نے اپنے مضمون ''قرۃ العین حیدر ایک نظر میں (سوانحی کوائف کے عنوان سے)'' میں قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ جو اس طرح ہے:

☆ افسانوی مجموعے:

1۔ ستاروں سے آگے	خاتون کتاب گھر	اشاعت اول، 1947
2۔ شیشے کے گھر	مکتبہ جدید لاہور	اشاعت اول، 1954

3۔ پت جھڑ کی آواز — مکتبہ جدید لاہور، مکتبہ اشاعت اول،1966 جامعہ دہلی

4۔ روشنی کی رفتار — ایجوکیشنل بک ہاؤس اشاعت اول،1982، علی گڑھ

مندرجہ ذیل تفصیلات جمیل اختر کی کتاب ''زندگی نامہ'' سے ماخوذ ہے[6]۔

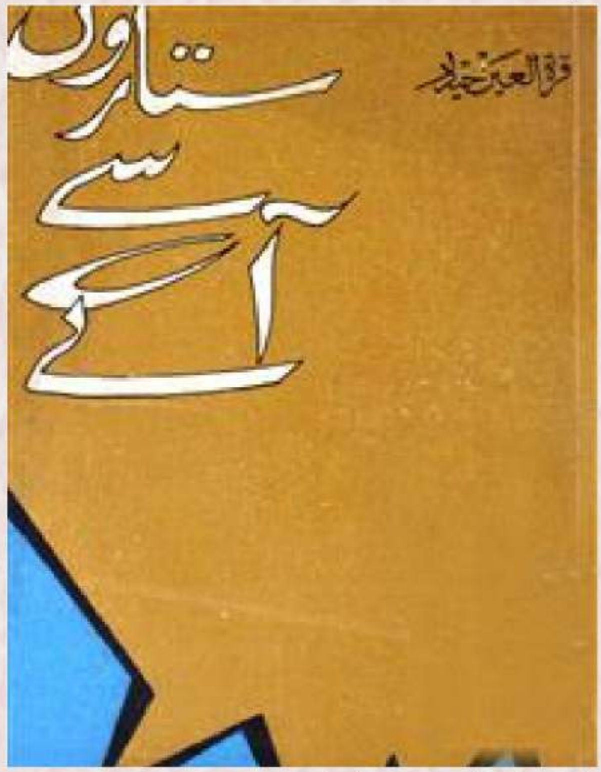

☆ **افسانوی مجموعوں میں شامل افسانے:**

افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے''

1۔ دیودار کے درخت — 2۔ پرواز کے بعد
3۔ سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا — 4۔ ٹوٹتے تارے
5 لیکن گومتی بہتی رہی — 6 ستاروں سے آگے
7 آہ! اے دوست — 8 ایں دفترِ بے معنی
9 ہم لوگ — 10 رقص شرر
11 یہ باتیں — 12 اودھ کی ایک شام
13 مونالیزا — 14 جہاں کارواں ٹھہرا تھا

افسانوی مجموعہ ''شیشے کے گھر''

1 جب طوفان گزر چکا — 2 سر راہ ہے
3 آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا — 4 میں نے لاکھوں کے بول سہے
5 برف باری سے پہلے — 6 کیکٹس لینڈ
7 یہ داغ داغ اجالا — 8 جہاں پھول کھلتے تھے
9 دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم — 10 انت بھئے رُت بسنت میرو
11 لندن لیٹر — 12 جلاوطن

افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز''

1 ڈالن والا — 2 جلاوطن
3 یاد کی دھنک جلے — 4 قلندر
5 کارمن — 6 ایک مکالمہ
7 پت جھڑ کی آواز — 8 ہاؤسنگ سوسائٹی

افسانوی مجموعہ ''روشنی کی رفتار''

1 آوارہ گرد — 2 ملفوظات حاجی گل بابا بکتاشی
3 فوٹوگرافر — 4 حسب نسب
5 سکریٹری — 6 نظارہ درمیاں ہے
7 دوسیاح — 8 یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
9 فقیروں کی پہاڑی — 10 اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے
11 سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعتراف — 12 روشنی کی رفتار
13 لکڑ بگھے کی ہنسی — 14 آئینہ فروش شہر کوراں
15 پالی ہل کی ایک رات — 16 در پل گرد سوارے باشد
17 جن بولو تارا تارا — 18 کہرے کے پیچھے

''قندیل چیں'' نیا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں وہ افسانے شامل ہیں جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔

1۔ ایک شام	ادیب، لاہور	نومبر 1943
2۔ ارادے	ادیب، لاہور	جون 1944
3۔ دریچے کے سامنے	ساقی، دہلی	جولائی 1944
4۔ خوابوں کے محل	ادیب، لاہور	ستمبر ۱۹۴۴ء
5۔ دھندلکوں کے پیچھے	ساقی، دہلی	جنوری ۱۹۴۵ء
6۔ میری گلی میں ایک پردیسی	عالم گیر، لاہور	جنوری-فروری 1945
7۔ زندگی کا سفر	شاعر آگرہ، افسانہ نمبر	اکتوبر 1945
8۔ دوسرا کنارہ	آج کل دلی	1 جون 1947

9۔	شیشے کے گھر جو ٹوٹ گئے	ساقی، دہلی	اکتوبر1948
10۔	پچھلے برسوں کی برف	ساقی، دہلی	نومبر1949
11	رام یہ کیسا گورکھ دھندا ہے	ادب لطیف، لاہور	مارچ1955
12۔	وہی زمانہ وہی فسانہ	نقوش، لاہور	مئی1958
13۔	دکھلائے لے جا کے تجھے مصر کا بازار	نقش، کراچی	1962
14۔	میں بوری ڈوبت ڈری	نقش، کراچی	1964
15۔	آوازیں	نقش، کراچی	1964
16۔	شربت والی گلی	شمع	جنوری1966
17۔	تار پر چلنے والی	شمع	نومبر1966
18۔	سنگاردان	نیادور، کراچی (40-39)	1967
19۔	ایک پرانی کہانی	نیادور، کراچی (شمارہ) نامعلوم	
20۔	بڑے آدمی	نقش، کراچی	1967

قرۃ العین حیدر کے وہ افسانے جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

1۔	متّا اور منّی	پراگ، دہلی (ہندی)	نومبر1991
2۔	طلسمی قالین (طنزیہ)	بیسویں صدی، دہلی	اگست1966
3۔	تلاش	بلٹز	سنہ نامعلوم
4۔	پرانی سرائے	سویرا، لاہور	نمبر12

افسانہ ایک عنوان دو (عنوان کتاب میں)

1۔	سکریٹری	روشنی کی رفتار
2۔	فقیروں کی پہاڑی	روشنی کی رفتار
3۔	لکڑ بگھے کی ہنسی	روشنی کی رفتار

افسانہ ایک عنوان دو (عنوان رسائل میں)

1۔	ایک تصویر	نقش، کراچی	1966
2۔	فن کار	شمع	اگست1966
3۔	چاندنی میں شکار	نیادور، کراچی	اپریل1979

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں بیسویں صدی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور حشر خیزیوں کے ساتھ ہمیں نظر آتی ہے۔ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''ستاروں سے آگے'' کی اشاعت کے وقت ہی ملک یکے بعد دیگرے برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے اور تقسیم جیسے اہم مسئلے سے نبرد آزما تھا۔ 1947 سے پہلے کے افسانوں میں بچپن اور نوجوانی کے دنوں کے خوابوں کی خوبصورت جھلکیاں ملتی ہیں تو بعد کے افسانوں میں خلفشار و انتشار کی گونج سنائی دیتی ہے ۔وطن عزیز کی تباہی و بربادی کی کربناکی ان کے ذہن و دل پر ثبت ہو چکی تھی ۔اس لیے بعد کے فکشن پر وہی رنگ غالب نظر آتا ہے۔قرۃ العین حیدر جس ماحول اور عہد کی تخلیق کار تھیں انھوں نے اپنی تخلیق میں اپنے ماحول اور عہد کو تمام سچائیوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک طرف نوابوں اور رئیس زادوں کی زندگی اور اس میں رونما ہونے والے نشیب و فراز کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں تو دوسری طرف تقسیم ہند کے سانحے اور اس سے پیدا ہونے والے بدترین حالات کو انھیں حقائق کی روشنی میں پیش کرتی ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کے افسانے اپنے عہد کا آئینہ ہیں۔

حواشی

1۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، مرتب: ارتضیٰ کریم، مشمولہ: 'ستاروں سے آگے' ایک تاثر: وارث علوی، ص: 550 روشان پرنٹرس نئی دہلی، 2016

2۔ قرۃ العین حیدر کا فن، عبدالمغنی، انجمن ترقی اردو (ہندی)، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 1985، ص:43

3۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر مسرت جہاں، انجمن ترقی اردو (ہند)، 214، ص:42

4۔ ایضاً

5۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، مرتب: ارتضیٰ کریم، مشمولہ: 'احوال و کوائف'۔ نند کشور، ص: 29۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 1992

6۔ ''زندگی نامہ'' تحقیق و ترتیب: جمیل اختر۔ ص 65۔ اشاعت: 2014، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

□□□

Dr. Hasina Khanam
D/o. Kamaruddin
Ward No.8.
Jawahar Nagar
Mehnagar
Distt,: Azamgarh-276204 (U.P.)
Mob: +91 9761885340

زینت جہاں

صالحہ عابد حسین کی فکشن نگاری

اردو میں افسانوی ادب کی اصطلاح انگریزی لفظ Fiction کے مترادف ہے۔ بلکہ کثرتِ استعمال سے لفظ Fiction جوں کا توں اردو میں مستعمل ہو چکا ہے۔ لفظ فکشن یا افسانوی ادب اپنے آپ میں کافی وسعت رکھتا ہے۔ اسی لیے مختلف مکاتب فکر کے نزدیک اس کے مفہوم کہیں کم کہیں زیادہ فرق ہے۔

فکشن: ایسی ہر تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے، فکشن کے زمرے میں آئے گی اسی لیے اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔ داستان ناول اور افسانہ (طویل یا مختصر) بھی ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی۔ یہاں تک کہ منظوم داستانیں بھی اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے۔ دورِ قدیم میں شاعری اور ادب دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔ لہٰذا ادب کو شاعری اور شاعری کو ادب کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں شاعری ادب کی منظوم اور ایک الگ شاخ کہلائی اور نثری ادب کا تصور آیا۔ چنانچہ دور قدیم میں قصہ کہانی کو بھی شعری لبادے میں ہی پیش کیا جاتا تھا۔ گویا تحقیقی کام 'اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کے جائزے' پر محیط ہے۔ مگر یہ ''نثری افسانوی ادب'' تک ہی محدود ہے۔ اس کے باوجود اس میں داستان تمثیل، ناول اور افسانے سے متعلق تنقید کا جائزہ شامل ہوتا ہے مگر ڈرامے، مثنویاں، منظوم داستانیں وغیرہ از خود اس مقالے کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہے۔ اُردو میں شاعری پہلے وجود میں آئی۔ بلکہ دنیا کی ہر زبان میں شاعری کے مقابلے میں نثر کا رواج بعد میں ہوا۔ نثر مہذب زندگی کی دین ہے اور شاعری انسان کی بنیادی محنتوں کا عطیہ ہے۔ اس لیے شاعری کی ترویج و ترقی بھی مناسب سطح پر ہوئی۔ اردو نثر کی طرف کافی دیر سے توجہ کی گئی اس کے اسباب و علل بھی واضح ہیں۔ کائنات کی ہر شئے خواہ جاندار ہو یا بے جان متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ یہی متحرک انسانی زندگی کا خاصہ ہے چونکہ ادب زندگی کا ایک ناگزیر شعبہ ہے جس میں انسانی زندگی کی اسی حرکت پذیری کے مختلف اور متنوع شیڈس دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں ادب سے میری مراد اردو ادب ہے جس کا دامن دیگر زبانوں کے ادب کے برعکس متفرق جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ اُردو ادب میں جہاں شاعری کی اہمیت و مقبولیت مسلم ہے وہیں اردو نثر کا بھی اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ نثری ادب میں اردو فکشن اپنی دلکشی ہمہ گیریت، وسعت اور تنوع کے اعتبار سے ہمیشہ ادبی حلقہ کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ باقاعدہ الجھاؤ سے بچنے کے لیے بیشتر ناقدین اردو فکشن میں ناول اور افسانہ کو ہی شامل فہرست رکھتے ہیں۔

داستان: اردو افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف داستان

بیسوی صدی کے اوائل تک عوام وخواص میں مقبول تو رہی لیکن ناقدین کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ تذکروں میں صرف شعراء کا ذکر ہوا۔ حالی نے شعرو شاعری کا مقدمہ تحریر کیا اور جب بیسویں صدی میں باقاعدہ تنقید کی ابتدا ہوئی تو صرف شاعری کو ہی قابل ذکر وفکر سمجھا گیا۔ خود داستان نگاروں نے داستان گوئی کے فن پر بحث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پہلی بار ''بوستانِ خیال'' کے مترجم خواجہ امان دہلوی نے فن داستان گوئی پر گفتگو کی۔ ''داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے، سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔'' اسے غالب کی تنقیدی رائے بھی کہا جاسکتا ہے۔ واقعہ عام طور پر مختصر ہوتا ہے لیکن اس کا بیان ہمیشہ طوالت اختیار کرجاتا ہے۔ داستان کی ابتدا بھی چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور روایتوں سے ہوئی جن کا جنم انسانی تہذیب کے ساتھ ہوا۔ داستان وقت گزاری کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ آج کے دور میں ایسے ادب کی ضرورت ہے جو زندگی کا عکاس ہو۔

ناول: ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اس سے ایک مخصوص صنف افسانہ مراد ہوتی ہے۔ جب انگریزی ادب کے زیراثر یہ صنف ہماری زبان میں منتقل ہوئی تو اس کا نام 'ناول' بھی اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ فن کے رو سے ناول اس نثری قصے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی عکاسی کی گئی ہو۔ شیکسپیئر تو زندگی کو ڈرامہ کہتا ہے لیکن ہمارے نزدیک حیات ارضی ایک مہتم بالشان ناول ہے جس کا مرکزی کردار انسانیت ہے۔ ناول میں زندگیوں کے مرقع پیش کئے جاتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس کا میدان عمل بہت وسیع ہے۔ اتنا ہی وسیع جتنی خود زندگی افسانوں کے افعال اور اقوال، خیالات اور جذبات، کامرانیاں اور ناکامیاں، پریشانیاں اور دقتیں، حماقتیں اور دانائیاں عظمت یہ سب ناول کے موضوعات ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ناول کی قسمیں بھی بہت سی ہیں لیکن آسانی کے لیے اسے دو بڑی قسموں میں رکھا جاسکتا ہے۔ ایک رومانی دوسری نفسیاتی۔

رومانی: رومانی ناول میں واقعات پر زیادہ زور ہوتا ہے اور اس سے تفریح، اصلاح یا مسرت آفرینی کا کام لیا جاتا ہے۔ اس میں مسائل حاضرہ پر بحث نہیں ہوتی بلکہ اس کا رجحان عجائب نگاری، مثالیت پسندی، جنگ آزمائی، بزم آرائی، اخلاق آموزی، محبت شعاری اور حسن آفرینی غرض ہر ایسے پہلو کی جانب رہتا ہے جہاں تخیل کی پرواز زیادہ بلند ہوسکے۔ ''مرأۃ العروس'' اردو کا پہلا ناول بھی ہے اور مولانا نذیر احمد کی شہرت کا پہلا ذریعہ بھی۔ اس میں ایک معزز اور شریف مسلمان خاندان کی گھریلو زندگی کا حال ہے۔ یہ کتاب مولانا نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی غرض سے لکھی تھی۔ اس سے عورتوں کی تعلیم ان کے سلیقے، سیرت اور انتظام، خانہ فارسی کے متعلق بہت نصیحتیں ملتی ہیں۔ ناول کے ذریعہ انسانی زندگی کو نئی روشنی ملتی ہے۔ نثر وشعر کی دیگر اصناف کے مقابلے میں ناول زندگی سے زیادہ گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ ناول کا اصل مقصد تفریحی ہے اس لیے ناول کے بیانیہ میں ایک دلچسپی کا عنصر ہونا لازمی ہے۔ ناول دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ ناول میں فطرتِ انسانی سے پردہ اٹھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ مغرب کے مقابلے میں اردو ناول نگاری ابھی بہت پیچھے ہے۔

اردو ادب میں فکشن نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں نہ صرف ممتاز ادیبوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بلکہ خواتین نے بھی فکشن نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کرایا ہے۔ ان خواتین فکشن نگاروں میں خدیجہ مستور، رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، بیگم صالحہ عابد حسین وغیرہ کے نام انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوتے ہی اہل قلم خواتین نے ان تمام موضوعات جن پر مرد لکھتے تھے خواتین کی توجہ کا بھی مرکز بن گئے اور انھوں نے آزادانہ لکھنا شروع کیا۔ ان موضوعات میں نفسیات، فلسفہ، جنسیات، تہذیب، سیاست اور سائنس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ یہاں صالحہ عابد حسین کی فکشن نگاری پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

افسانہ: اگر ہم اردو افسانہ کی ابتدا اور تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا غالباً 1903 میں ہوئی۔ 2003 میں یہ اپنی عمر کے سو سال مکمل کرچکا ہے اور مختلف پیچیدہ مراحل سے گزرتے ہوئے تا حال اس کا سفر پوری قوت سے جاری ہے۔ ناولوں کے مقابلے میں ان کی تعداد کم وبیش ایک چوتھائی ہے۔ اس نسبت سے ان میں تنوع کی بھی کمی ہے جو ناولوں میں نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو افسانہ ناول کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسندانہ رہا ہے اور اس کا فن اور ادبی معیار بھی بلند رہا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ افسانہ میں اختصار کی وجہ سے تخیل اُڑان کا موقع نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ اس میں وحدت تاثر کی وحدت سے اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ واقعہ جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے انسانی زندگی کی حقیقی صورتِ حال سے تعلق رکھتا ہو۔ بہرحال افسانوں کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے: (1) معاشرتی افسانہ (2) مزاحیہ افسانہ (3) رومانی افسانہ (4) تراجم افسانہ۔

معاشرتی: معاشرتی افسانوں میں ایسے افسانے بھی شامل ہیں جن میں نفسیاتی انداز نظر غالب ہے لیکن چونکہ ان میں معاشرتی ماحول کا بھی عکس ہے اور اُردو میں ایسے ناول اور افسانے شاذونادر ملتے ہیں جن

کی بنیاد نفس پر ہو اس کے لیے الگ عنوان قائم نہیں کیا گیا۔

رومانی: رومانی افسانوں کے ذیل میں چند ایسے مجموعے بھی ملیں گے جن میں اسراری یا سائنسی رنگ نمایاں نظر آئے گا لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت قلیل ہے اور ان میں بھی رومانی رنگ کی آمیزش ہے اس لیے انھیں رومانی کے تحت رکھا گیا ہے۔

اردو زبان وادب کی ابتدا اور ارتقاء میں سرزمین دکن اور اہل دکن کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ چنانچہ نثری قصوں کی ابتدا کا سراغ بھی یہیں ملتا ہے۔ ملا وجہی کی 'سب رس' 1635 دکن کی ہی نہیں اردو کی اوّلین قدیم نثری کہانی ہے۔ دکنی زبان کے نثری افسانے کی جتنی کتابیں اب تک دریافت ہوئی ہیں ان میں 'سب رس' قدیم ترین ہے۔ یہ ایک تمثیلی قصہ ہے۔ اس میں حسن اور عشق کی کشمکش اور عشق ودل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانوی ادب میں تمثیلی قصوں کی بھی شمولیت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب رس کا دیباچہ جسے خود ملا وجہی نے لکھا ہے قابل توجہ ہے۔ حالانکہ وجہی نے قصہ سے متعلق کوئی خاص اشارے تو نہیں کیے لیکن پھر بھی اس عہد میں اس کو اہمیت حاصل ہے۔

صالحہ عابد حسین کی شخصیت اور ان کی ادبی زندگی

صالحہ عابد حسین اردو کی وہ نامور ہستی ہیں جنھوں نے ناول بھی لکھے، افسانے، داستان اور ڈرامے اور بچوں کی کہانیاں بھی قلمبند کیں۔ نیز وہ تنقید اور تبصرے میں بھی پیچھے نہیں رہیں۔ تقریباً 72 کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ وہ 18 اگست 1913 کو پانی پت میں محلّہ انصار میں صبح کے وقت مولانا حالی (جو مشہور شاعر، ادیب اور مصلح تھے) کے تاریخی گھر میں ان کی پوتی مشتاق فاطمہ کے گھر میں پیدائش ہوئی۔ ان کے والد خواجہ غلام الثقلین تھے۔ یہ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ وکیل تھے۔ انھوں نے ہندوستان اور خاص طور سے مسلمانوں کو جدید تعلیم وتہذیب سے واقف کرانے کے لیے بہت کام کیے اور رسالہ نکالا۔ باپ نے بیٹی کا نام مصداق فاطمہ رکھا۔ ابھی مصداق دو سال کی ہی تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اس لیے مصداق اور ان کے بھائی بہنوں کی سرپرستی کی ذمہ داری ان کے چچا خواجہ غلام السبطین نے لے لی۔ حالی جو مصداق کے پرنانا تھے انھوں نے سب سے پہلے اپنی شاعری اپنے مضامین میں عورتوں پر جو ظلم ان کے ساتھ ناانصافی، ان کو تعلیم سے محروم رکھنے پر، احتجاج کیا اور عورتوں کی تعلیم اور آزادی پر زور دیا اور اپنے گھر میں اپنے قصبہ میں عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ مصداق فاطمہ کی ماں بھی پڑھنا جانتی تھیں۔ پھوپھیاں بھی، خاندان کی دوسری عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں اس لیے جب مصداق نے ہوش سنبھالا تو ان کو بھی گھر میں پڑھایا جانے لگا۔ ابھی مصداق صرف چودہ برس کی تھیں کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ صدمہ اتنا بڑا تھا کہ مصداق بے حال ہو گئیں۔ ان صدموں کا مصداق پر بہت اثر ہوا اور اپنگ غم لکھنے پڑھنے، روزے، نماز، قرآن کی تلاوت میں بھلانے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک مضمون لکھا ''اماں کے بغیر'' مگر وہ کسی کو نہیں بھایا اور اپنے شوق اور بڑے بھائی کی مدد سے انھوں نے چھوٹے چھوٹے مضمون عورتوں کے رسالوں میں لکھنے شروع کیے۔ چونکہ اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا اور وہ پردے میں رہتی تھیں اس لیے ان کو اپنا نام چھپوانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ مضمون کبھی بنت خواجہ غلام الثقلین، کبھی ہمشیرہ خواجہ غلام السیدین کے نام سے لکھتیں۔ مصداق کو اپنا نام پسند نہیں تھا اس کے معنی ہیں 'مثال'۔ بچپن میں جب ان کی والدہ زندہ تھیں تب یہ لوگ علی گڑھ چلے گئے۔ مصداق کو وہاں عبداللہ گرلز اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

ماں کے انتقال کے بعد مصداق نے پانی پت کی لڑکیوں کے اسکول میں کچھ دن پڑھا اور بہت اچھے نمبروں سے مڈل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے دیا اور فرسٹ کلاس میں پاس ہوئیں۔ سیدین صاحب کی 1929 میں شادی ہو گئی اور مصداق مستقل طور سے علی گڑھ میں رہنے لگیں۔ انگریزی، اردو اور فارسی زبان اور ادب اور اس کے ساتھ تاریخ اور مذہب کا مطالعہ کرتی رہیں۔ اب ان کی عمر انیس سال ہو گئی تھی اور اس زمانے میں یہ عمر شادی کی سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر عابد حسین جو جامعہ ملیہ میں کام کرتے تھے ادیب تھے اور سیدین صاحب کے گہرے دوست تھے۔ حالی کے خاندان میں لڑکیوں کی شادی ان کی مرضی سے ہوتی تھی چنانچہ مصداق سے بھی پوچھا گیا کہ وہ کس سے شادی کریں گی۔ انھوں نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو پسند کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ ان کی عمر زیادہ ہے دوسرے وہ جامعہ میں بہت چھوٹی تنخواہ پر کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ شادی کر کے آپ کو بہت تکلیف بھری زندگی گزارنی پڑے گی۔ مصداق نے کہا کہ وہ اپنی زندگی کا ساتھی ایسے شخص کو بنانا چاہتی ہیں جو پڑھا لکھا ہو۔

اس طرح مصداق کی شادی اپریل 1933 میں ڈاکٹر عابد حسین سے ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ جامعہ ملیہ (جو اس وقت قرول باغ میں تھی) آ گئیں۔ اس زمانے میں جامعہ کی چھوٹی سی برادری ایک بڑے خاندان کی طرح رہتی تھی اور پیسے کی کمی سے جو تکلیفیں تھیں ان کو یہ لوگ خوشی خوشی برداشت کرتے تھے۔ مصداق جواب صالحہ عابد حسین کہلانے لگی تھیں وہ بھی اس برادری کا حصہ بن گئیں۔ ڈاکٹر صاحب اور عجیب صاحب (جو عابد صاحب کے دوست تھے) دونوں انھیں ''مصداق بھابھی'' کہتے تھے۔

1934 میں مصداق ماں بنیں مگر بچی پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیاری ہوگئی اور پھر ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انھیں اس کا بہت غم تھا مگر انھوں نے اس غم کو خدا کی عبادت، لکھنے کے کام، دوسروں کے بچوں کی خدمت اور محبت میں لگا دیا۔ ان کے لکھنے، پڑھنے کے شوق کو اُن کے بھائی اور ان کے شوہر نے بڑھاوا دیا۔ انھوں نے شادی کے بعد پنجاب سے بی اے آنرز کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس میں پاس ہوئیں۔ وہ انگریزی کی کتابیں بھی پڑھنے لگیں۔ قرآن شریف وہ ہمیشہ ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھتیں۔ ان کو مولانا ابوالکلام کا ترجمان القرآن بہت پسند تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ ہم جس مذہب کے ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوں اسی مذہب کو بغیر سمجھے پڑھے ہوئے اختیار کرلیں بلکہ ہمیں خود اس مذہب کے بارے میں معلومات ہونا چاہیے۔ اپنے مذہب کے ساتھ ہمیں دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ شادی کے چار پانچ سال بعد ان کے گردے کا آپریشن ہوا اور ان کا ایک گردہ نکال دیا گیا پھر ان کو دمہ کا مرض لاحق ہوا جو آخری وقت تک رہا اور طرح طرح کی بیماریاں ہوتی رہیں۔ وہ خاندان کی لڑکیوں اور لڑکوں کو اپنے پاس بلا کر رکھتیں۔ ان کی تربیت کرتیں۔ خاص طور سے انھیں لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گھر، خاندان، ملک اور دنیا کے لیے عورت اگر اچھی ہو، تعلیم یافتہ ہو، اس کی اچھی تربیت ہوئی ہو تو امن اور سلامتی کا پیام ہوتی ہے۔ اپنے خاندان کی لڑکیوں کو اپنے پاس بلا کر ان کی تربیت کرتیں۔ محلے، پڑوس کی لڑکیوں کو بھی وہ بہت چاہتیں۔ 1953 میں انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ یورپ کا سفر کیا اور اس کا دلچسپ حال سفرنامے کی صورت میں لکھا۔ انھوں نے اس عرصہ میں کئی ناولیں اور افسانے لکھے۔

عمر کے ساتھ ساتھ ان کی صحت بھی گرنے لگی اور ان کے عزیز بھائی بہن، بھانجی اور آخر میں ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ ان صدموں کا بھی ان پر بہت اثر پڑا مگر پھر بھی وہ خود کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتیں۔ انھوں نے حج بھی کیا اور ایران وعراق بھی گئیں۔ 1983 میں انھوں نے اپنی دوست کی بیٹی ڈاکٹر عذرا رضا کے کہنے سے امریکہ کا سفر بھی کیا۔ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ سفر تو نہ کرسکیں لیکن واشنگٹن کی سیر کی۔ اپنا علاج کرایا اور ایک ڈیڑھ ماہ رہ کر ہندوستان آگئیں تو بہت دن تک صحت مند رہیں۔ اب ان کو اکثر دل کی تکلیف رہنے لگی۔ دمہ تو تھا ہی جنوری 1988 کی تاریخ کو ان کو دمہ کا دورہ پڑا جو کسی دوا سے ٹھیک نہیں ہوا۔ ان کی تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے سے ان کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔ 8 جنوری 1988ء کو باتیں کرتے ہوئے ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ خدا کو پیاری ہوگئیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 74 سال تھی۔

کرنل بشیر حسین زیدی ان کے بھائی اور شوہر کے دوست تھے اور ان کو بھائیوں کی طرح چاہتے تھے۔ انھوں نے ان کو اس طرح یاد کیا ہے ''خدا نے انہیں سراپا محبت بنایا تھا۔ وہ اپنے پرائے سب سے بہت محبت اور ہمدردی کا سرچشمہ تھیں۔ وہ بہت غیرت منداور خوددار تھیں۔ انھوں نے اپنے لیے کوئی مدد لینا گوارا نہیں کیا۔ البتہ ضرورت مندوں کے لیے وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ذرا بھی نہیں جھجکتی تھیں۔ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ کمزور طبقہ سے ان کو خاص ہمدردی تھی۔ وہ ان سے ناانصافی برداشت نہیں کرتی تھیں اس کے لیے وہ دوسروں سے لڑ بھی جاتی تھیں۔ دوستوں سے بہت محبت کرتی تھیں ان کے لیے یہ شعر بہت موزوں ہے:

دردِ دل پاسِ وفا جذبہ ایماں ہونا ☆ آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

صالحہ عابد حسین کو ان کے ادبی کاموں پر 1983 میں پدم شری کا خطاب ملا۔ اس کے علاوہ اور انعام ملے مثلاً سرسوتی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، امتیازِ میر وغیرہ۔ ان کو جب انعام سے نوازا جاتا تو وہ بہت خوش ہوتی تھیں مگر وہ ان کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ لکھنے والے کا سب سے بڑا انعام تو یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے اسے پسند کریں اور جن لوگوں کی زندگی کے دکھ وسکھ کو ہم بیان کرتے ہیں ان سے انھیں خوشی ہو۔ انھوں نے اپنی تحریر میں عام انسانوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو سیدھے سادھے انداز میں پیش کیا۔

ادبی خدمات: صالحہ عابد حسین نے ادب کے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ افسانے لکھے، ناول لکھے، ڈرامے لکھے، سوانح اور تنقید نگاری کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ ان کا پہلا ناول ''عذرا'' اور آخری ناول'' ساتواں آنگن'' ہے۔

عذرا: ناول ''عذرا'' کی اشاعت پہلی بار مئی 1947 میں کتابی دنیا لمیٹڈ سے ہوئی تھی اس کے بعد ناول کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ ناول کی تصنیف 1940 میں شروع ہوئی تھی۔ ناول تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ 1916 سے 1922 تک، دوسرا حصہ 1923 سے 1928 تک اور تیسرا حصہ 1920 سے 1931 تک کے زمانے کو پیش کرتا ہے۔ تقریباً پانچ سو صفحات کے اس ضخیم ناول میں صالحہ عابد حسین نے اپنے عہد کے مختلف معاشرتی اور اخلاقی دھاروں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ قصہ کا مرکزی کردار عذرا کے گرد گھومتا ہے جو روایت پرستی کی مخالف اور سماجی وقومی خدمات کی حمایتی ہے۔ عذرا کی ماں نسیمہ خاتون

شوہر کے انتقال کے بعد اپنے بچوں اور بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا ارادہ کر لیتی ہے۔ان کے عزیز اور رشتے دار مخالفت کرتے ہیں۔خاص طور پر ان کی بہن جمیلہ خاتون بچیوں کی تعلیم اور لڑکیوں کو انگریزی تعلیم دینے کی سخت مخالفت کرتی ہیں مگر نسیمہ خاتون اپنے شوہر محسن علی کے مرنے کے بعد اپنی بے بسی اور شادی شدہ زندگی میں بھی اپنی کم علمی کے نتائج دیکھ چکی ہیں اس لیے وہ ساری دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود بیٹے ریاض کو ملک سے باہر بھیجتی ہیں اور عذرا کو بھی اعلیٰ تعلیم دلواتی ہیں۔انھیں بس ایک ہی فکر ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی، تعلیم حاصل کرتے ہوئے اپنے مذہب کی پابندی کرتا رہے اور اس سلسلہ میں انھیں اپنی اس تربیت پر بھروسہ ہے جس نے ان کی اولاد کو صالح بنایا ہے۔تعلیم کے سلسلہ میں ریاض کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیجا اور عذرا کی تعلیم کا بھی پورا خیال رکھا۔

کردار: ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے۔عذرا کا تو خیر مرکزی کردار ہے اور اس کی شخصیت کے مختلف گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ماں نسیمہ اور خالہ جمیلہ خاتون کے کردار نسوانی کرداروں میں اہم ہیں اور زندہ کہے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ حالات کے نشیب وفراز سے گزرتے ہیں۔مردوں میں انصار کا کردار ہی جاندار کہا جاسکتا ہے ۔دیگر کرداروں میں فرحت حسین کا کردار ہی کچھ اہم مانا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں تغیرات کی پرچھائی ملتی ہے۔ویسے تو عذرا کا کردار ہی ناول کا خاص موضوع اور محور ہے مگر ناول میں عذرا کے کردار کو تین مختلف منزلوں میں دکھایا گیا ہے۔اس کے بچپن اور طالب علمی کا دور پھر اس کا محبت کرنا اور شادی کرکے بیوی بن جانا اور آخر میں قومی خدمت گار کی حیثیت سے سامنے آنا، یہ سارے امور اس کے کردار میں کشش پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔صالحہ عابد حسین نے جس طرح عورتوں کی تعلیم پر زور دیا ہے اور بیجا روایت پرستی کی مخالفت کی ہے اس سے ان کی جرأت اور روشن خیالی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔یہ وہ دور تھا جب متوسط اور اعلیٰ متوسط طبقہ کی لڑکیاں اس طرح کی آزادی کا خواب دیکھ رہی تھیں جس طرح کی آزادی کی علمبردار عذرا ہے یا بہ الفاظ دیگر صالحہ عابد حسین ہیں۔شاید اسی لیے یہ ناول خواتین میں بے حد مقبول ہوا۔صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری کی مختلف جہتوں کے اثرات بآسانی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔اس میں عام خاتون ناول نگاروں کی طرح عذرا نام کی لڑکی کو مرکزی کردار مان کر تمام تر واقعات اس کے گرد رقص کرتے دکھائے گئے ہیں۔خواتین کے دوسرے ناولوں کی طرح یہاں بھی عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی پر زور دیا گیا ہے۔ عذرا کا کردار آزادی سے قبل کئی روشن خیال لڑکیوں کا مثالی کردار ہے جس میں روایت کی پاسداری اور اس سے بغاوت دونوں پہلو موجود ہیں۔اس ناول میں جس طرح مردوں اور عورتوں کو آزادی کی لڑائی میں عملی حصہ لیتے ہوئے دکھایا گیا ہے اس سے پریم چند کے بعض ناولوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد کے معاشرتی، اخلاقی اور اصلاح کا پہلو بھی ناول میں نمایاں ہے۔

راہِ عمل: صالحہ عابد حسین کا دوسرا ناول ''راہِ عمل'' بھی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو پیش کرتا ہے۔مہاتما گاندھی کی عدم تشدد کی تعلیم کے باوجود دیہاتوں اور قصبات کا پر تشدد ماحول گاؤں کی سادا اور فطری زندگی، کسانوں کی بدحالی، توہم پرستی اور اس کے پہلو بہ پہلو ان سادہ لوحوں کے چاروں طرف بڑھتا ہوا سازشوں کا جال، شہروں کی ہر تصنع زندگی اور عیش وعشرت کا ماحول یہ ساری باتیں اور ان باتوں کے ساتھ ساتھ آزادی کی جدوجہد کے لیے بڑھتی ہوئی لگن کو صالحہ عابد حسین نے ناول میں پیش کی ہے۔

کردار: ناول کے مرکزی کردار حبیب میاں، ان کی منہ بولی بیٹی گیتا اور بیوی حسینہ بیگم، دو پرجوش نوجوانوں انوپم اور ندیم اور دوسرے کرداروں کے ذریعہ یہ دکھایا ہے کہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے معاملہ میں مظلوم طبقہ تیزی کے ساتھ متحد اور متحرک ہو رہا ہے اور گاؤں میں تعلیم کے ذریعہ نہ خوشحال اور بیدار ہو رہا ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ نہیں پیچیدہ ہے اور بعض ضمنی قصے قاری کو الجھا دیتے ہیں۔زبان وبیان کی دلکشی اور احوال معاشرہ کی پیش کش کے اعتبار سے ناول خاصہ دلچسپ ہے۔

اپنی اپنی صلیب: اپنی اپنی صلیب کا انداز صالحہ عابد حسین کے دوسرے ناولوں سے کچھ الگ ہے۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار اپنے کسی ناول کے قصے کو حیات وکائنات کے وسیع تناظر میں ایک فکری موڑ دینے کی کوشش کی ہے۔ناول کا پلاٹ 'راہِ عمل' کی طرح پیچیدہ نہیں بلکہ سیدھا سادھا ہے۔پس منظر کے طور پر یہاں بھی ایک متوسط جاگیردار خاندان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

کردار: ناول کا مرکزی کردار علی اصغر ہے جو ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔ناول اس کی بیماری کے واقعات سے شروع ہوتا ہے اور موت کے واقعہ پر ختم ہوتا ہے۔باقی واقعات فلیش بیک کی تکنیک میں بیان کئے گئے ہیں۔علی اصغر کی شادی ایک آئی سی ایس کی لڑکی رضوانہ سے ہوئی ہے۔ میاں بیوی کے مزاج میں فرق ہونے کی وجہ سے یہ شادی ناکام ہو جاتی ہے۔اس کی والدہ نے اپنی سگی بہن کی بیٹی کو صرف اس کی غربت کی وجہ سے بہو نہیں بنایا مگر قسمت کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ علی اصغر ولایت نہیں جا پاتے اور حمرہ وہاں چلی جاتی ہے۔ وہ علی اصغر سے محبت کرنے کے باوجود خود کو

مقصود سے وابستہ کر دیتی ہے لیکن وہ دونوں ناخوش رہتے ہیں اور آخر میں علی اصغر بے وقت موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ تاثر مکمل ہو جاتا ہے۔ صالحہ عابد حسین کی قوت مشاہدہ کی مہارت یہاں بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

گوری سوئے سیج پر: یہ ناول بھی ایک کرداری ناول ہے جس میں مہرو کے مرکزی کردار کے گرد پورا قصہ گھومتا ہے۔ مہرو کا شوہر سہیل اس کی موت کے بعد اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تمام گزشتہ واقعات کو یاد کرتا ہے۔ اس طرح ناول کی تشکیل ہوتی ہے۔ مہرو جیسی وفادار اور سیدھی سادھی گھریلو لڑکی کی ایثار پسندی کے مقابلے میں سہیل کی بے وفائی اور تسیم سے وابستگی ناول میں ایک ایسی کشمکش کو جنم دیتی ہے جس کے پس منظر میں زندگی کے دوسرے مسائل بھی سامنے آتے ہیں۔

الجھی ڈور: صالحہ عابد حسین کی ناولوں میں اس لیے منفرد مقام حاصل ہے کہ اس میں گھریلو زندگی کی الجھنوں اور اخلاقی گراوٹ کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ اس ناول میں صالحہ عابد حسین نے زندگی اور وہ بھی عہد حاضر کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور روایتی قدروں کی پابندی کو کردار اور شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

یادوں کے چراغ: ''یادوں کے چراغ'' کے بارے میں ڈاکٹر کہکشاں پروین کی رائے ہے۔ وہ کہتی ہیں:

''یادوں کے چراغ ایک معیاری ناول ہے۔ اس ناول میں حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت سامنے آتی ہے۔ اس کا مرکزی کردار کنول ہے جس کی زندگی کے پیچ وخم ہی سے ناول کے پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کا پلاٹ بہت مربوط اور منظم ہے۔ یہاں ہندوستان کی اس وقت کے سیاسی حالات واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ ملک کی آزادی کا چرچا...... صالحہ عابد حسین کی وطن پرستی کو ظاہر کرتا ہے۔'' (صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار، ص-134-133)

ساتواں آنگن: ''ساتواں آنگن'' صالحہ عابد حسین کا آخری ناول ہے جو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی سے 1984 میں شائع ہوا۔ ''ساتواں آنگن'' سچ تو یہ ہے کہ خود صالحہ عابد حسین کی بھی کہانی ہے اور ان کے وسیلے سے دور حاضر کی ان تمام عمر رسیدہ خاتون کی کہانی ہے جو پے در پے حادثات واقعات کے نتیجہ میں رونما ہونے والے دکھوں کی صلیب تنہا اپنے کاندھوں پر اٹھائے۔ آخر کار سرحد پار کر جاتی ہیں۔ ان کے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر حنفی نے لکھا ہے:

''موجودہ مصنوعی زندگی اور ایک دو نسل پہلے کی حرارت سے بھرپور زندگی کا تضاد پورے ناول پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ زینب کی زندگی میں آنے والے میکے کا آنگن، کالج کا آنگن، پردیس کا آنگن، سسرال کا آنگن، پیار کا آنگن، بیٹے کا آنگن ان صحافت پر تمام تر لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ اجاگر کرتے ہوئے پرانی وضع داریاں رشتوں کے تقدیس اور پھر ان کی شکست وریخت کے تناظر میں ناول اس طرح سانس لیتا ہے کہ پڑھنے والے خود کو اس منظر کا ایک جز سمجھنے لگتے ہیں اور آخر میں زینب کی موت کے دلگداز منظر کے ساتھ ساتواں آنگن یعنی دوسری دنیا کا ہلکا سا آنگن نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بلاشبہ ساتواں آنگن اپنی طرز کے ناولوں میں ممتاز ترین ہے۔'' (جائزے مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص-176)

زندگی کی عام خوشیاں، مسرتیں، مسائل، غم و الم، سکھ دکھ اور واقعات ان کے ناولوں میں ہر جگہ موجود ہیں۔ رومانی، سماجی اور معاشرتی ناولوں میں جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں دیکھنی ہوں تو ان کے ناولوں کا مطالعہ کافی ہے۔ وہ حالی کے خاندان کی ایک فرد ہیں اس لیے جس خوبصورت، بامحاورہ اور شیریں زبان کا انھوں نے استعمال کیا ہے وہ لائق متوجہ ہے۔

افسانے: ناول کے علاوہ صالحہ عابد حسین کے افسانے بھی قابل ذکر ہیں: پہلا افسانوی مجموعہ 'نقش اولی 1929'، دوسرا مجموعہ 'ساز ہستی 1926'، 'نراس میں آس' اور 'نونگے' شائع ہوئے۔

نراس میں آس (افسانوی مجموعہ): اس مجموعہ میں سات افسانے ہیں۔ لوٹ، جسے اللہ رکھے، دستیر، نراس میں آس، بھائی، پانی پت، آخری سہارا۔

1948 میں شائع ہونے والے اس مجموعے کے سبھی افسانے فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق ہیں۔ اس وقت جو تباہی و بربادی ہوئی، بے گناہوں کا خون ہوا اور عورتوں کو برباد کیا گیا، اس کا ذکر ان افسانوں میں بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی جو تصویر صالحہ عابد حسین نے کھینچی ہے وہ بہت کچھ حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ حصہ جو بلوائیوں کے ہم مذہب افراد سے متعلق ہیں جنھوں نے بہت سے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو پناہ دے کر انتہائی اخلاقی کام انجام دیا ہے۔ صالحہ عابد حسین اور اردو کے دیگر افسانہ نگاروں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو ادب کا کارنامہ ہے۔

نونگے: اس مجموعے میں نو افسانے ہیں۔ شماتت، ہم سایہ، ملاپ، ماں، بوا، سہاگ رات، بابا، خوشی کی چند گھڑیاں، ایک عالم ہے اسی رنگ میں، ہمدرد۔

شماتت ہم سایہ: اس میں گھر میں چوری ہو جانے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ دراصل خود مصنفہ کے گھر میں سات آٹھ بار چوری ہو چکی تھی۔ چوری کے واقعات سے متاثر ہو کر یہ واقعہ لکھا گیا ہے۔ اس موقع پر دوسرے تماش بین آ کر ہمدردی کرنے کے بجائے جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے ہیں جو تسلی کے بجائے رنج کا باعث ہوتی ہے۔

ملاپ: ملاپ میں سلیمان اور عذرا کی ازدواجی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

ماں: دوسرے افسانے ''ماں'' میں ایک ممتا بھرے دل کی کہانی ہے۔ مصنفہ نے اس میں دکھایا ہے کہ عورت اپنے بدصورت اور اپاہج بچے سے بھی انتہائی محبت کرتی ہے جیسا ایک خوبصورت تندرست بچے سے کرتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ محنت مزدوری کرتی ہے اور اپنے بچے کے سہارے اس تکلیف دہ زندگی میں بھی خوشی محسوس کرتی ہے۔

ڈرامے: صالحہ عابد حسین نے ڈراموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ افسانوں کے علاوہ ڈرامے بھی قابل ذکر ہیں۔ 'بنیادی حق'، (سوشل ڈرامہ)، 'امتحان (پانچ سین کا ڈرامہ) ان کے ڈرامے ہیں

کہانیاں: صالحہ عابد حسین اولاد کی رحمت سے محروم تھیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ اپنا پیار اور محبت کہانیوں کے ذریعہ ان تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

صالحہ عابد حسین کی فکشن نگاری کی حیثیت

1 ان کی تحریروں میں اسلامی افکار کا حسن مشترکہ تہذیبی اقتدار کی طاقت، سماجی بصیرت اور ذاتی تجربوں کا رنگ شامل ہے۔

2 ان کی تحریروں میں بے تعصبی ملتی ہے۔

3 خواتین کی تعلیم اور ان کی آزادانہ زندگی کی فکر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

4 ان کے افسانوں کا پس منظر قومی ہوا کرتا ہے۔ جواہر لال نہرو اور دوسرے قومی لیڈروں سے ان کا نزدیکی رابطہ رہا ہے اس لیے کہیں کہیں اس کی جھلکیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

5 صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں زندہ دلی کو پیش کیا یا جس کے ذریعہ زندگی سے روبرو ہونے کا موقع ملا۔

6 ناولوں کے ذریعے سماجی اہمیت کو پیش کیا گیا۔

7 آپ کی فکشن نگاری میں خواتین کو اس وقت کے تہذیبی تناظر میں موضوع بحث بنایا گیا اور ان کی فکشن نگاری پر روشنی ڈالی گئی۔

محاسن: اردو ادب میں فکشن نگاری کی روایت میں صالحہ عابد حسین ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ خاص طور پر ایسی ادیبہ کے طور پر جس نے اسلوب تحریر اور فکشن کی نئی بنیاد ڈالی۔ سماج و معاشرہ کی کج روی پر تنگ نظری، اوہام پرستی اور پوشیدہ خواتین کی شکست کے خلاف ناول، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ اپنی بات کہی۔ ناولوں کے ذریعہ عورت کو اس کی اہمیت اور آزادانہ زندگی سے روشناس کرایا۔ ان کے ناول زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں اور کردار اتنے سچے ہیں کہ ان کے ذریعہ زندگی کے روبرو ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

□□□

کتابیات

1۔ آتش خاموشی، صالحہ عابد حسین، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گول مارکیٹ 1987، دریا گنج، نئی دہلی

2۔ اپنی اپنی صلیب میں // // مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 2013/

3۔ آج کا کبیر // // مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

4۔ اردو فکشن کی تنقید، ڈاکٹر ارتضٰی کریم / شعبہ اردو، دہلی

5۔ اردو ناول نگاری، سہیل بخاری، الحمیر اپبلشرز، دہلی، جولائی 1972

6۔ الجھی ڈور، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

7۔ بات چیت، صالحہ عابد حسین، ہیٹیٹ پریس رامپور سے شائع، 1946

8۔ بچوں کی صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی

9۔ تفریح، صالحہ عابد حسین، بہار اردو یوتھ فورم

10۔ داستان سے ناول تک، ڈاکٹر ابن کنول، بھارت آفسیٹ پریس، دہلی 2001

11۔ دادودرماں، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

12۔ عذرا (ناول)، صالحہ عابد حسین، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1987

13۔ سلسلہ روز و شب (خودنوشت)، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر صغریٰ مہدی عابد والا مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1986

14۔ ساتواں آنگن // // کتابیں جامعہ نگر، نئی دہلی 1984/

15۔ فکشن کا صغیر رحمانی، انجم پروین، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2017

16۔ گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین / جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

17 نراس میں آس // // کتاب پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی

18۔ یادوں کے چراغ (ناول) // // اشرف پریس لاہور میں شائع 1967

☆☆☆

Zeenat Jahan

Research Scholar, KMCL University.

Sitapur, Hardoi Bypass Rd,

Lucknow-226013 (U.P)

ڈاکٹر رفیعہ سلیم

مظہر الزماں خاں

ہمارے عہد کا آخری داستان گو

ایک شہر جو کبھی آباد تھا کے حوالے سے

مظہر الزماں خاں عصری افسانوی ادب کا ایک معروف نام ہے۔ مظہر الزماں خاں 7/اپریل 1950 میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنا اولین افسانہ ''کالا تاج محل'' 1965 میں لکھا جب ان کا افسانہ ''منزل کے لیے'' جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے رسالہ ''شب خون'' کے ذریعہ 1973 میں منظر عام پر آیا اور راتوں رات مظہر الزماں خاں کا نام افسانہ کے قاری اور نقادوں کے ذہنوں پر طلسم بن کر ہوش ربائی کرنے لگا اور جب صبح ہوئی تو مظہر الزماں خاں جدید اردو افسانہ کا ایک اہم نام قرار دیا گیا۔

ان کا اولین افسانوی مجموعہ ''ہارا ہوا پرندہ'' 1977 اور پہلا ناول ''آخری زمین'' 1987 میں منظر عام پر آیا ہے تب سے لے کر اب تک کئی افسانوی مجموعے اور ناول منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کے فن پر شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ وارث علوی، حقانی القاسمی اور فضیل جعفری جیسے بڑے بڑے نقاد کے علاوہ ایک طویل ناموں کی فہرست ہے۔ جنھوں نے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ انگریزی زبان میں بھی مظہر الزماں خاں کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا ہے۔ میرے خیال میں مظہر الزماں خاں کی کہانیاں کسی فرد واحد کا کرب نہیں بلکہ اجتماعی و آفاقی اظہار

یہ ہوتی ہیں۔ جس میں وقت کا استعمال مسلسل ومتواتر تواتر کے ساتھ جاری وساری رہتا ہے۔ ان کی کہانیوں کو سمجھنے کے لیے یقیناً وزیر آغا نے بڑے ہی موثر انداز میں ان کے کرداروں کی کیفیت کا اظہار کیا ہے:

''مظہر الزماں خاں کی کہانیوں کے اندر کے جہاں کو دیکھنے کے لیے جس آنکھ کی ضرورت کا احساس ہے وہ ایک باطنی جہان ہے۔ مظہر الزماں خاں جب وقت، سمندر، زخم، موسم، تنہائی اور دستکیں، جنگل اور ویران آبادیاں جیسے موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں تو اسرار کے پردے آہستہ آہستہ اترنے لگتے ہیں...... مظہر الزماں خاں کے نزدیک زمین سے آسمان تک علائم اور اشارے پھیلے ہوئے ہیں اور یہ علائم واشارے دراصل وہ رابطے ہیں جو غیاب وشہود کے مابین قائم ہیں۔''

(مظہر الزماں فکر وفن کے درمیان، مرتب: مشتاق صدف ص: 212 تا 213)

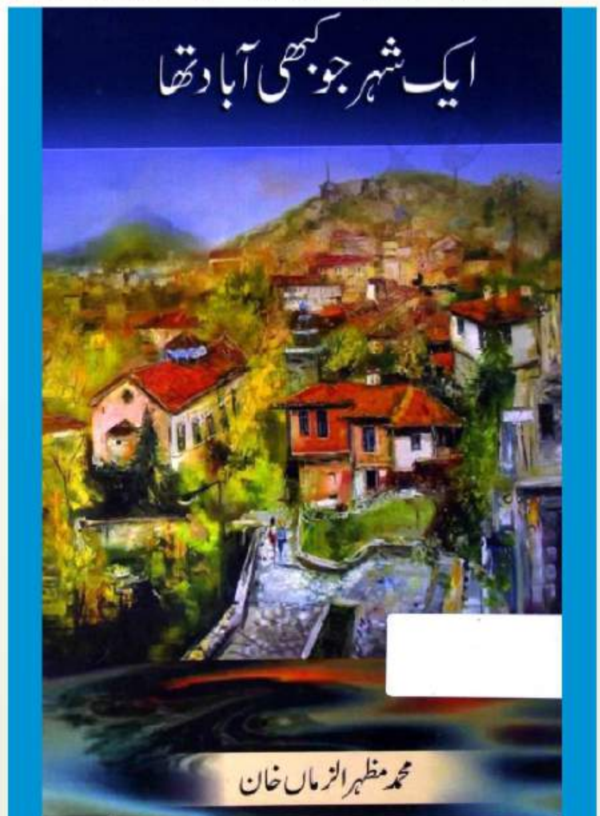

''ایک شہر جو کبھی آباد تھا'' مظہر الزماں خاں کا ایک اہم افسانوی مجموعہ ہے جو 2018 میں منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جس میں 15 کہانیاں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کا اولین افسانہ'' آخری پوسٹ مین'' ہے یہ افسانہ رسالہ 'آجکل' میں شائع ہوا تھا اور اس کے علاوہ کہانی ''ایک بوند پانی کی'' الیاس شوقی صاحب کے رسالہ 'قلم' کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ ان کہانیوں پر نقادوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

لہٰذا عرض کر دوں کہ یہ کہانیاں اپنی علامتوں اور استعاروں کی وجہ سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اسلوب کی وجہ سے بھی منفرد ہے۔ وہ اس لیے کہ مظہر الزماں کی اکثر وبیشتر کہانیاں تمثیلی پیرائے میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں لیکن اس مجموعے کی اولین کہانی'' آخری پوسٹ مین'' دراصل ایک بھرپور بیانیہ کہانی ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے پوری زمین کا منظر نامہ بیان کیا ہے، اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عصر حاضر میں تمام زمین پر ایک انسان بھی موجود نہیں ہے کہ (سارے انسان سوالیہ نشان ہے)؟ یعنی انھوں نے انسانوں کو قوسین میں پیش کیا ہے اور اس طرح پیش کرنا از حد ضروری بھی تھا کیونکہ یہی اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ پوسٹ مین انسان کو ڈھونڈنے پھر رہا ہے تاہم اسے مایوسی ہوتی ہے کہ اس کہانی میں دنیا کے سارے مقامات کو اشاروں میں بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس کہانی کا اختتام چونکانے والا ہے۔ یہاں میں ایک حوالہ دینا چاہتی ہوں۔

''اور پھر میں اس دور کا آخری پوسٹ مین ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بستی کے آخری گھر سے نکل کر آہستہ آہستہ قدموں سے گھر کے پچھلے حصہ میں اُگے ہوئے پیپل کے ایک درخت کی طرف بڑھتا ہوں جس پر ہمہ اقسام کے پرندے بیٹھے، اونگھ رہے تھے۔ میں ان میں سے ایک پرندہ کو پکڑتا ہوں اور پھر اس خط کو پرندہ کے پنجے میں باندھ دیتا ہوں اور پھر اسے آسمان کی طرف اُچھال دیتا ہوں درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے اپنی اپنی آوازوں میں چیخنے لگتے ہیں........!!''

(آخری پوسٹ مین، از: مظہر الزماں خاں، ص:20)

واحد متکلم میں لکھی اس کہانی کا انجام اپنے اندر کئی اشارے چھوڑتا ہے اور اس کہانی کا انداز اردو افسانے کی دنیا میں بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ مظہر الزماں خاں کی کہانیوں میں علامتوں واستعاروں اور افکار کا ایک ہجوم سا ہوتا ہے جو ان کی کہانیوں کو نئے امکانات سے وسیع تر کرتے ہیں۔

مظہر الزماں خاں اپنی کہانیوں کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

''میری کہانیوں میں موضوع کے ساتھ خیال، فکر، حالات، موسم، ماحول اور افکار جو معنی کا ایک بڑا ہجوم ہوتا ہے اور وہ اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ اور ایسے کردار ہوتے ہیں جو ہماری زمین اور آسمان کو پہنچانتے ہیں اور ہر ادلتے بدلتے ہوئے منظر کو بڑی گہرائی سے دیکھتے سمجھتے اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔'' (نمک خوانِ تکلم، ادبی انٹرویوز، از: مشتاق صدف، ص: 215)

’’کہانی ایک بوند پانی کی‘‘ اس مجموعہ کی دوسری اہم کہانی ہے یہ بھی بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہے اس کا واحد متکلم خود مصنف ہے۔ جو اپنے آپ کو بطور سائنس داں پیش کیا کرتا ہے اور وہ سائنسدانوں کی نفی کرتا نظر آتا ہے کیونکہ وہ قدرت کی صناعی سے انکار کرتے ہیں اقتباس دیکھئے:

’’وہ آنکھیں پیدا کرو جو بیج کے اندر پوشیدہ، شاخوں، پتوں، جڑوں، اور پھلوں، پھولوں، ہواؤں اور طوفانوں کو دیکھتی ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے کہ تم صرف ایک عکس ہو____ اور تمہاری ہی طرح اس زمین پر جو اب ایک بارود کا ڈھیر بن چکی ہے____ لاکھوں عکس موجود ہے جو پیدا ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔‘‘

(کہانی ایک بوند پانی کی، از: مظہر الزماں خاں، ص:30 تا 31)

یعنی مظہر الزماں خاں کے مطابق سائنس اور سائنس دانوں نے اپنی بہترین کارکردگی سے حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسانی سکون لمحہ بھر کے لیے بھی موجود نہیں۔ ان متحیر سائنسی ایجادات نے مزید الجھنیں بڑھا دی ہیں۔

اس مجموعہ کی تیسری کہانی ’’بستی‘‘ ہے اس کہانی میں زمین پر آباد ان تمام بستیوں کو پیش کیا گیا ہے جو ہمیں دکھائی دینے کے باوجود نظر نہیں آتی یعنی بظاہر جو بستیاں ہمیں دکھائی دے رہی ہیں دراصل وہ ویسی نہیں ہو تی ہیں۔ تاہم اس کہانی کی ایک ایک بستی غائب ہونے کے باوجود اپنی جگہ موجود ہے۔

اس کہانی کے مطالعہ کے دوران بار ہا ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کہانی میں پیوست ایک اور کہانی ہے جو اس کہانی کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس کہانی کے تمام کردار دراصل وقت اور حالات کی ستم ظرفی کے آگے انسانی بے بسی کا نوحہ بیان کرتے ہیں یہ کہانی اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے اور ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

کہانی ’’حلف نامہ‘‘ دراصل جب ہم عہد الست میں قالو بلیٰ کے قافلے میں تھے اس پر لکھی گئی کہانی ہے۔ جسے انسان دنیا میں آنے کے بعد فراموش کر چکا ہے۔

یہ کہانی دراصل متصوفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کہانی میں جا بجا صوفیانہ پہلو دکھائی دیتے ہیں کہ انسان کو دنیا میں حرص سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ قناعت کے ذریعہ ہی انسان کو ذہنی اور دلی سکون میسر ہوتا ہے۔

میرا یہاں اس طویل اقتباس کو نوٹ کرنا دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ مظہر الزماں خاں اپنی کہانیوں میں تصوف کے اسرار و رموز بھی نہایت عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جس کے ذریعہ انسان اپنی ہستی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور صوفیائے اکرام کی زندگی کا مقصد حیات، ان کی صداقت کا راستہ، اخلاقی اقدار، علم کا حصول، فنا و بقاء، جبر و ظلم، خیر و شر، صبر و رضا وغیرہ تصوف کے ان تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار کا درس وہ اپنے کرداروں کے ذریعہ ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کا یہی امتیازی وصف انھیں اُردو فکشن کا آخری داستان گو کہلانے کا مستحق قرار دیتا ہے۔

’’کہانی موسمی مورخ‘‘ کا عنوان یہ ظاہر کرتا ہے کہ آجکل سیاست داں کس طرح سے موسم کی طرح تاریخی حقائق کو جھٹلاتے ہیں۔ مظہر الزماں خاں نے سماج کے مسائل و مشکلات کی بہترین عکاسی کی ہے اور جس المیہ کو ’’حرف‘‘ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے وہ غور طلب ہے! اقتباس دیکھیے:

’’فلاں فلاں عمارتیں، ’’ٹ‘‘ کے بجائے حرف ’’ر‘‘ نے بنوائے ہیں۔ اور فلاں فلاں راستے۔ قلعے، تاج، کنویں، باغ اور سرائے کبوتروں کے بجائے ’’کوؤں‘‘ نے بنوائے ہیں؟..... اے ہمارے مورخ تم نے تو تاریخ مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن کیا تمہارے اس طرح تاریخ کو غلط سلط بیان کرنے سے تاریخ کی حقیقت تبدیل ہو جائیگی؟‘‘

(کہانی موسمی رخ، ص:57)

مظہر الزماں خاں اس مجموعہ کی ایک اور کہانی ’’بے زمین لوگ‘‘ کے ذریعہ شناخت کی تلاش کے پیچیدہ مسائل پر سوال اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔

’’کون ہو تم؟ اور اس بے رنگی گھر کے اندر کیسے اور کب چلے آئے کہ یہ ہمارا گھر ہے کئی لوگوں نے جو گیروی لباس میں ملبوس تھے بیک وقت کرخت آواز میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا کہ ان کی آنکھوں کے اندر سائے گھوم رہے تھے...... تمہاری موجودگی کا یا ہونے کا کیا جواز ہے؟.......

کیا مطلب؟؟؟ اس نے حیرت سے کہا کہ اس کے لب پھڑ پھڑا رہے تھے۔

مطلب یہ کہ تم ہمارے اس گھر میں کیوں اور کس طرح داخل ہوئے؟..... اب بھی سمجھ میں آیا کہ نہیں یا پھر سمجھنا ہی نہیں چاہتے!‘‘

(بے زمین لوگ، ص: 59)

اس طرح موجودہ عہد کے کئی ایک اہم سماجی مسائل پر وہ بات کرتے ہیں۔ اپنے کرداروں کے ذریعہ ایسے ایسے سوال اُٹھاتے ہیں کہ

عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یوں بھی مظہر الزماں خاں کا انداز تحریر تہہ دار ہوتا ہے کہ کئی بار ان کی کہانیوں کو پڑھ لیجئے سمجھ میں کچھ نہیں آئیگا بار بار اعادہ کرنا پڑیگا۔ مظہر الزماں خاں خود اپنی کہانیوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''غور سے ہماری کہانیاں سنو سمجھو! الفاظ کی پھیلی ہوئی جڑوں کو زمین کے اندر دیکھو کہ ہر لفظ کے اندر ان گنت نام، ان گنت چہرے، ان گنت سر اور ان گنت کہکشائیں پھیلی ہوئی ہیں اس سارے اچھے برے غیاب و شہود کا ہجوم ہیں ہماری یہ کہانیاں۔''

(مظہر الزماں فکر و فن کے درمیاں، مرتب: مشتاق صدف، ص:211)

یقیناً مظہر الزماں خاں اردو فکشن کا وہ اہم نام ہے جس کی تخلیقات نہ صرف نئے نئے امکانات کی بشارت دیتی ہیں بلکہ ایک نیا منظر نامہ پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ اپنے خاص رنگ کا اظہار بنی ہوئی ہیں۔

کہانی ''ہم زاد'' دراصل نفس امارہ پر مبنی کہانی ہے آج کا انسان نفسیاتی تقاضوں کا اسیر ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے مکر و فریب کے جال میں خود اپنے آپ سے الجھتا جا رہا ہے۔ اس کہانی کا آخری اقتباس اس بات کا بین ثبوت ہے۔

''ہم نے ان طاغوتی دروازوں کو خود ہی کھول کر انھیں اپنے اندر بلا لیا ہے جو ہمارے لیے ممنوع تھے اس لیے اب وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں...... چنانچہ تم اگر انہیں محسوس کرنا چاہتے ہو یا دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی یعنی ناڑی کو اپنے کان پر رکھ لو....... ہم سبھوں کے نفس کا یہی حال ہے۔''

(کہانی ہم زاد، ص:66)

کہانی ''قم'' دراصل بے جان و بے حس آدمی نما لوگوں کی زندگی کا نوحہ ہے اس میں انسان کے ظاہر اور باطن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جو موجودہ معاشرے میں دم توڑتی ہوئی، سسکتی ہوئی انسانی زندگی کے کرب کو تخلیق کار نے اپنی بے پناہ فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''ایک عجیب و غریب وضع و قطع کا بارلیش شخص جو ایک قدیم ترین لباس میں ملبوس ہے۔۔۔۔۔ ہر ایک فرد کو پکڑ کر یا راستہ میں روک کر ''قم'' کہہ رہا ہے اور اس کے اس طرح قم کہنے پر لوگ برہم ہو ہو کر اس اجنبی سے الجھ الجھ کر طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے ہیں۔۔۔ قم سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا ہم سب کے سب تمہیں سوئے ہوئے یا پھر مرے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ جو بقول ساری بستی کے تم ہر ایک فرد کو پکڑ کر قم کہہ رہے ہو تو اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ تم ہونے کا وجود باقی نہیں ہو۔ صرف بقایا ہو۔ بے ثبوت یا لاموجود بقایا۔''

(کہانی قم، ص: 67 تا 68)

مظہر الزماں خاں کے یہاں بے پناہ مذہبی موضوعات کا ذکر ملتا ہے جو یقیناً ان کی ذہانت اور مطالعہ کا ثبوت دیتی ہیں۔

اس طرح میں نے اس مذہبی فلسفہ سے لبریز کہانی کو کئی بار سمجھنے کی کوشش کی بس اتنا لکھنے کی جسارت کرتی ہوں کہ یہ دراصل فنا و بقا کا فلسفہ ہے۔ اور ان کی مبہم علامتوں کی تعبیر کرنا بہت مشکل کام ہے اسی لیے میں یہاں حقانی القاسمی صاحب کے الفاظ مستعار لینا چاہتی ہوں۔

''مظہر الزماں خاں کا ذہن ایک محشر خیال ہے۔ ان کے یہاں موضوعات اور مسائل کا اژدھام ہے ان کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی تخلیق میں تحریر کی پر اسرار مگر تابناک فضاء ہوتی ہے۔ ان کا ہر لفظ تابند اور بہت

کچھ بولتا ہوا سا لگتا ہے۔لا روش خو کے فقرہ کی طرح ہر فقرے میں ایک جہانِ تمثال تہہ نشیں ہے۔ان کے لفظوں میں جو لہریں ہیں وہ زماں و مکاں سے ماورا ساعت بے کراں سمندروں سے ملاتی ہیں۔ ہر لفظ میں تحرک اور ایک نئی کیفیت کی نمود اور جملوں کے دروبست اس قدر مضبوط اور مستحکم کہ ان کے جملوں کے دریچوں سے بھی بہت سے فلسفے، افکار و نظریات معانی و مقامات منکشف ہوتے ہیں۔

مظہر الزماں خاں کے یہاں مٹیا مورفوس کا عمل نمایاں نظر آتا ہے۔نئی معنویت کی جستجو، کہنہ فرسودہ افکار کو جہانِ تازہ کی سیاحت، افکار و اظہار میں نزہت اور ندرت پیدا کرنے کی روش نے ان کی تخلیق کو منفرد اور مختلف بنا دیا ہے۔''

(''درد کا پورٹریٹ'' فلیپ، از: حقانی القاسمی)

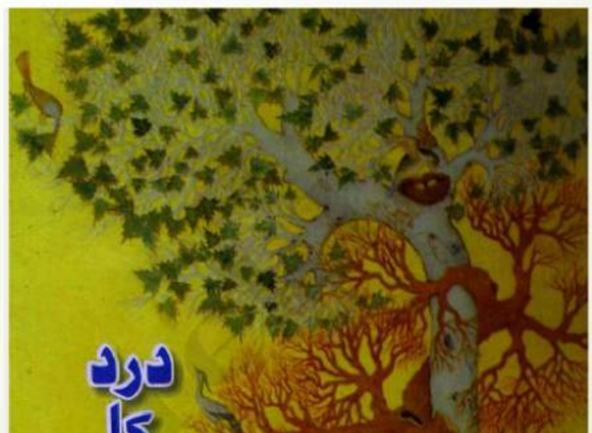

مظہر الزماں خاں کی کہانیوں میں پیوست کئی ایک کہانیوں کے موضوعات موجود ہوتے ہیں۔ جو انسانی زندگی میں رونما ہونے والے تغیرات کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں ''کہانی خوف کے درمیان'' ایک طرح سے انسان کو مسحور کر دینے والی کہانی ہے جس میں انہوں نے انسانی نفسیات کے اس نازک ترین اور پیچیدہ پہلوؤں کو پیش کرنے کی بڑی عمدہ کوشش کی ہے اس کہانی میں انسان کے المناک خوابوں کا خوف شامل ہے مظہر الزماں خاں فکشن کا ایک ایسا سنگتراش ہے کہ مجسمے بھی اپنی روداد بیان کرتے نظر آتے ہیں۔یقیناً وہ انسانی درد و کرب کی حقیقتوں سے بہرہ ور ہو کر دوسروں کو اپنا ہمنوا بناتے ہیں انسانی خوف جو دراصل ایک نفسیاتی کیفیت ہے جسے انہوں نے بڑی باریک بینی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ کی ایک اور کہانی ''وقت'' ہے بقول افسانہ نگار پہلے پہل انہوں نے اس کہانی کا عنوان ''آسمان'' رکھا تھا۔اس معروف کہانی پر سوت آفریقہ سے ممتاز تجزیہ نگار سید تحسین گیلانی جو ششماہی کتاب انٹرنیشنل خرمن کے مرتب بھی ہیں نے بھرپور تجزیہ کیا تھا۔اور وہ اپنے معنی خیز تجزیہ میں قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔اقتباس پر غور کریں۔

> ''اب وقت کیا ہوا ہے'' یہ جملہ لینگویج (Language) کے اعتبار سے کچھ اور Meaning رکھتا ہے مگر وہی وقت ہے جو پہلے تھا۔ Language اور Parole کے اعتبار سے انسانی ذہنی Sequence کو جھنجھوڑتا ہے کہ ہر انسان کو وقت گزرنے پر ہی وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ کیوں ہوتا ہے۔'' (رسالہ خرمن، از: سید تحسین گیلانی، ص:386)

مظہر الزماں خاں اپنی کہانی میں لکھتے ہیں میں گیا وقت نہیں ہوں بلکہ وقت کی اہمیت قدر و قیمت کا اندازہ جانتا ہوں تب ہی تو وہ اپنے آپ کو ان کہانیوں کا بانی قرار دیتے ہیں۔اقتباس دیکھئے جو ہم سبھوں کو نہ صرف غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے بلکہ وقت کے احساس کا احساس بھی دلاتا ہے۔

> ''رائٹر کی حیثیت سے کسی نام کے بجائے وقت لکھا ہوا تھا کہ اس عظیم اور ضخیم ترین ناول کا مصنف میں ہوں.....وقت ...... اور پھر اس پر وقت کے دستخط ثبت تھے اور وقت کے دستخط کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ۔'' میں وقت ہوں اور یہ میری لکھائی ہے۔لیکن اس ناول کا بانی محمد مظہر الزماں خاں ہے...... جو میری تصویر ہے۔''

(کہانی: وقت، از: مظہر الزماں خاں، ص:92)

تاہم میں یہ عرض کروں کہ یہ کہانی انسانی جڑوں کی تاریخ بیان کرتی ہے یعنی خود مظہر الزماں خاں نے اپنے آپ کو وقت کا یعنی منصف بتایا ہے کیونکہ کہانی کے اختتام پر انھوں نے کہانی کار کے طور پر وقت کے دستخط ثبت کیے ہیں۔یعنی وقت کی اہمیت کا بیان ہی کہانی کا مرکزی خیال ہے۔

مظہر الزماں خاں کی تخلیقات اور پھر ان کی کہانیوں کا بھرپور احاطہ کرنا وہ بھی ایک مضمون میں ممکن نہیں ہے بار ہا ان کہانیوں کو پڑھنے کے

بعد کچھ الفاظ اکٹھا کرنے کی جسارت کی ہوں۔ کہانی ''اس آباد خرابے میں'' کا موضوع دراصل ہمارے عہد میں باعمل، نیک، باضمیر انسانوں کے قحط کا اعلان نامہ ہے۔ چنانچہ اس کہانی میں انہوں نے متقی و پرہیز گار شخص کا آدمیوں کے اس جمگفیر بھیڑ میں گم ہوجانے کو پیش کیا ہے۔ یعنی یہاں تخلیق کار نے ہمارے عہد کے ان لوگوں پر ضرب کاری کی ہے اس دنیا کو پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نیک صفت ہستی کو سمجھنے والا اس کے اپنے ماحول میں موجود دکھائی نہیں دیتا ہے تو تب وہ خود کو اس جگہ سے اپنے آپ کو الگ کرنے کی کوشش میں بھٹکتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس باعمل ہستی کی گفتگو یا خیالات کے اظہار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والے اس کے اطراف بکھرے ہوئے لوگوں میں جو موجود نہیں ہیں اور یہی لوگ ایسی باعمل ہستیوں کو مجذوب، پاگل یا دیوانہ سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے حساب سے فیصلے صادر کر تے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مظہر الزماں خاں اس کہانی میں مجذوب شخص کو ایک کباڑ خانے میں قید کر رکھا ہے اور وہ وہاں اپنا وقت گذارنے لگتا ہے دفعتاً اس کباڑ خانے میں ایک آدمی پہنچتا ہے اور اسے چھو لیتا ہے تو وہ مجذوب شخص مٹی ہو جاتا ہے جو ہمارے معاشرے پر بھر پور طنز ہے۔
اقتباس دیکھئے:

> ''وہ صحیح تھا۔ غلطوں کے ہجوم میں وہ صحیح تھا بہت زیادہ صحیح تھا۔ لیکن عہد حاضر کے غلط ہجوم میں گھر جاتا ہے اور وہ اس ہجوم سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ لیکن آنے والا وقت اسے تلاش کر لیتا ہے..... آج کے اس خراب عہد میں صحیح چیزیں لاپتہ ہو گئی ہیں۔''

(اس آباد خرابے میں، ص:105 تا 106)

چنانچہ مظہر الزماں خاں کا کہنا ہے کہ وہ اس ابدال جیسی ہستی کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ تلاش کرتے رہیں گے اور عصر حاضر کے لوگوں کو اس اذیت ناک، افلاس زدہ ماحول سے نجات دلانے کی حتی الامکان اپنی کوشش اپنے قلم کے ذریعہ جاری رکھیں گے۔ یہی وہ منفرد طرز تحریر ہے جو انھیں افسانہ نگاروں کی کہکشاں میں ایک خودساختہ روشن ستارہ قرار دیتا ہے اور وہ اپنی اس انوکھی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے ہی اپنی انفرادیت کا نقش افسانے کے منظرنامے پر ثبت کئے ہوئے ہیں۔

اس مجموعے کی مرکزی کہانی جس کے عنوان پر مجموعہ کا نام رکھا گیا ہے وہ ہے ''ایک شہر جو کبھی آباد تھا'' اس کہانی کے ذریعہ وہ موجودہ عہد کی پیچیدگیوں، فرد اور معاشرے کے درمیان ہونے والی کشمکش کو موضوع بحث بنایا ہے۔

> ''مختلف ممالک کے سیاحوں کا قافلہ شیخ سعدی کا مرثیہ پڑھتا ہوا جب شہر میں داخل ہو رہا تھا ایک سیاہ کتا شہر کے اندر سے دوڑتا ہوا آیا اور ہم سیاحوں کے پانو کے درمیان سے ہوتا ہوا شہر سے باہر نکل گیا اور جب ہم شہر مصر روم میں داخل ہوئے تو فصیل جسم سے پشت لگائے ایک ہزارہا سالہ بوڑھا بیٹھا ہوا تھا جس کے قریب ایک پھٹا ہوا جوتا پڑا ہوا تھا جس میں ایک مرا ہوا سفید چوہا تھا اور فصیل کی دائیں طرف ایک جدید توپ رکھی ہوئی تھی جس کا رخ شہر کی طرف تھا اور توپ چی کے مقام پر ایک الو بیٹھا اونگ رہا تھا ہزار سالہ بوڑھے نے رقت انگیز آواز میں ہم سیاحوں سے کہا رکو! اور شہر برباد میں داخل ہونے سے پہلے اس شہر کی مختصر کہانی سنتے جاؤ کے یہ شہر آباد ہونے سے پہلے بھی میں موجود تھا اور برباد ہونے کے بعد بھی موجود ہوں کیونکہ آبادی اور بربادی کے درمیان بس ایک سانس لیتا ہوا لمحہ ہوتا ہے جو اپنے حصار سے نکل جاتا ہے تو شہر ویران ہوجاتے ہیں چنانچہ اس شہر کی آبادی کے پانو جب پہلی بار پیدا ہوئے تھے تو حالات مطمئن اور اعتدال پسند تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کا اطمینان اور اعتدال رخصت ہوتے گئے اور ایک دن بے اعتدالی نے انہیں بالکل پاگل بنادیا۔''

(کہانی: ایک شہر جو کبھی آباد تھا، از: مظہر الزماں خاں، ص: 93 تا 94)

مظہر الزماں خاں موجودہ عہد کی پامال ہوتی ہوئی تہذیب اور شکست خوردہ ماحول، خوف و دہشت، ناکامیوں و محرومیوں میں گھرے ہوئے عہد کا کرب اس کہانی میں بیان کرتے ہیں اور ہمارے عہد کے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ دراصل جب قوم غفلت بزدلی، بے حسی اور کاہلی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں تو صفحۂ ہستی سے قوموں کی بنائی ہوئی تاریخ کو زوال آجاتا ہے اور شہر کے شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعہ وہ قوم کو متحرک و متحد کرنے کا پیغام دیتے ہیں یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

□□□

Dr. Rafia Saleem
Dept. of Urdu
University of Hyderabad
India Post Lingampally CR Rao Road,
Gachibowli
Hyderabad-500046 (Telangana)

ہاجرہ بانو
کی انشائیہ نگاری کا فکری جائزہ

اردوادب کی نثری اصناف میں جلوۂ صد رنگ کی حیثیت رکھنے والی صنف ''انشائیہ'' دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے کم عمر صنفِ نثر ہے۔ ایک علاحدہ صنف نثر کی حیثیت سے انشائیہ کی عمر اردوادب میں مختصر سہی لیکن مختلف اصناف کے سائے میں یہ عرصۂ دراز سے پلتی رہی ہے یعنی انشائیہ کے آثار داستانوں، خطوط اور دوسری کئی اقسام نثر میں پائے جاتے ہیں۔ انشائیہ ایک خاص اسلوب میں لکھی جانے والی نثری تحریر ہے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے، جس میں داخلی کیفیت کے ساتھ ساتھ لامرکزیت، شگفتگی، بے تکلفی، آزادہ روی، ترنگ، مزاحیہ اور موج ومستی کی کیفیت ہوتی ہے۔ انشائیہ ایک ایسی تحریر ہے جو مضمون کی مانند تو لگتی ہے مگر مضمون سے اپنا ایک جداگانہ انداز اور اسلوب رکھتی ہے یعنی یہ مضمون کی ایک خاص قسم ہے، جس میں کوئی مرکزی خیال وتسلسل کے بجائے آزادہ روی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور قطعیت کے بجائے سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں مصنف اپنے ذہن کی ترنگ کو آزاد چھوڑ کر بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں انشائیہ نگار کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

1960 کے بعد اردو انشائیہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت منظر عام پر آتی ہے جس نے اردو انشائیہ کے خدوخال، فن وتکنیک اور اس کی شعریات پر نہ صرف کُھل کر بحث کی بلکہ انشائیے کے تعلق سے اردو قاری کے اذہان میں جو ابہام تھا اُس کو بھی دور کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس جماعت کے روح رواں تھے۔ انھوں نے انشائیہ نگاری کو ایک تحریک کی شکل دی اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں انھوں نے لاہور سے ایک ادبی جریدہ ''اوراق'' جاری کیا۔ جس میں انھوں نے انشائیہ شناسی کے موضوع پر بحث ومباحثہ شروع

کیا، نئے انشائیہ نگاروں کی راہ نمائی اور حوصلہ افزائی کی اور عام قارئین کے دلوں میں انشائیہ کا ذوق پیدا کیا۔

تقسیم کے بعد اردو کی دیگر اصناف بالخصوص ناول، افسانہ اور شاعری کے مقابلے میں انشائیہ نگاری میں خواتین کی تعداد بہت کم رہی ہے اور جن خواتین نے اس صنف کی طرف توجہ کی ان میں بھی اکثر ثابت قدمی کا مظاہرہ نہ کرسکیں۔ البتہ کچھ خواتین ایسی بھی ہیں جنھوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو جاری وساری رکھا۔ ان میں ڈاکٹر ہاجرہ بانو کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

ڈاکٹر ہاجرہ بانو نئی نسل کی انشائیہ نگاروں میں اپنی الگ اور منفرد پہچان بنا چکی ہیں۔ وہ وزیر آغا کی تخلیقات سے صنف انشائیہ کی طرف مائل ہوئیں اور انشائیہ نگاری میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ ہندوستان کی خواتین انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر ہاجرہ بانو اس لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ انھوں نے انشائیہ کے واضح تصور کے تحت انشائیے لکھے۔ یہاں کی دیگر خواتین انشائیہ نگاروں کی تخلیقات میں مزاحیہ انداز غالب ہے جب کہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے انشائی انداز اپنا کر اپنے خیالات وتاثرات کو شگفتگی کے ساتھ اپنے انشائیوں میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر ہاجرہ بانو بیک وقت ایک محقق، ناقد اور انشائیہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی تنقیدی مضامین لکھے جو ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''تنقیدی تلازمے'' میں شامل ہیں۔ انشائیہ نگاری سے دلچسپی کے نتیجے میں انھوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ''اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے حاصل کی۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے بعد میں جب اس تحقیقی مقالہ کو کتابی شکل دی تو ادبی حلقوں میں اس کتاب کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے فلیپ پر حقانی القاسمی نے ڈاکٹر ہاجرہ بانو کی اس کاوش کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> ''کتاب کی ایک ایک سطر تمہاری محنت، ریاضت، ژرف بینی اور ذہانت کی گواہی دے رہی ہے۔ تمھیں شاید پتا نہیں کہ عصری جامعات کے بہت کم مقالات کو اتنی گواہیاں نصیب ہوتی ہیں۔ یہ تمہاری خوش بختی ہے کہ نئی نسل کے محققوں کی بھیڑ میں سب سے الگ نظر آرہی ہو۔ تم نے اپنی تحقیق سے انشائیہ کی تقدیر کو تابندہ کر دیا ہے۔ انشائیہ کی چمک ماند پڑتی جارہی تھی، تم نے اپنی تحریر سے اس میں نئی جان ڈال دی ہے۔ انشائیہ کے صنفی خدوخال، فنی وفکری اور سماجی سیاسی سروکار پر تمہارا یہ ڈسکورس آئندہ کی تحقیق کے لیے نئی مشعل روشن کرتا رہے گا۔ تمھیں امید نہ ہو مگر مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے ادبی مورخین کے لیے یہ کتاب حوالہ جاتی ثابت ہوگی۔''

(حقانی القاسمی، بحوالہ؛ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار: ایک تجزیاتی مطالعہ، از، ڈاکٹر ہاجرہ بانو، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2013)

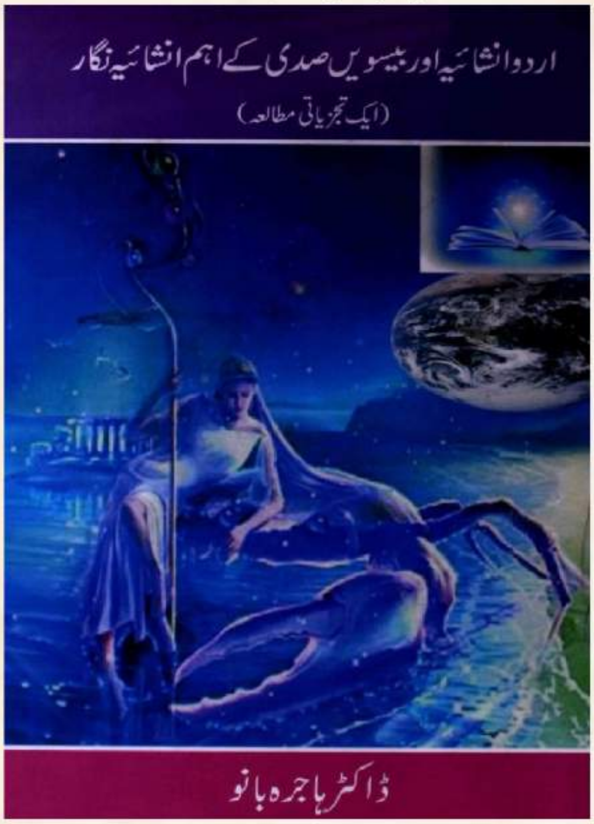

اس لیے یہ کتاب انشائیہ پر اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخی حیثیت کی حامل ہے اور انشائیہ پر کام کرنے والوں کے لیے نشان راہ بھی ہے۔

ڈاکٹر ہاجرہ بانو کے انشائیے ہندوپاک کے موقر رسائل وجرائد جیسے ماہنامہ شاعر، امنگ، بزم سہارا، اثبات، شگوفہ وغیرہ میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ اپنے ان انشائیوں کو انھوں نے ایک گلدستہ کی شکل دے کر ''باغِ بہشت'' کے عنوان سے 2014 میں منظر عام پر لائیں۔ ان کے اس انشائی مجموعہ ''باغِ بہشت'' میں کل بارہ انشائیے شامل ہیں۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنی ماں کے نام کیا ہے۔ یہ تمام انشائیے ان کے تجربے اور اعلیٰ تخیل کی گواہی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات وتاثرات کو انشائی شکل دے کر انسانی زندگی اور اس کے سماج کے مخفی گوشوں کو سامنے لاتے ہوئے اپنے عہد اور معاشرے کا عمیق جائزہ لیا ہے۔

اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر ہاجرہ بانو انشائیہ کے فن کی نزاکتوں، باریکیوں اور گہرائیوں کا واضح احساس رکھتیں ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ

بانو کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی انشائیہ لکھتیں ہیں وہ ان کے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے منفرد انداز میں موضوعات کو نئے مدار میں سفر کرنے کا موقع دیتی ہیں۔ آزاد خیالی، غیر رسمی اور شگفتہ انداز سے وہ اپنے دلچسپ اور انوکھے تجربے میں قاری کو شریک ہی نہیں کرتی بلکہ اسے ہم خیال بھی بنالیتی ہیں۔ بسیار خوری، کنگ فشر (King Fisher)، ای جنریشن (E-Generation)، آل از ویل (All is Well)، دائرہ دھنک وغیرہ ایسے انشائیے ہیں جن میں صورت گری ہے، تخیل کی اڑان ہے اور پس منظر کی دلکشی میں تصور کے رنگ ہیں۔ یہ ایسے انشائیے ہیں جن میں انھوں نے عصری آگہی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کاوش کی ہے۔

انشائیہ کو ذہن کی آزاد ترنگ کہا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس میں انشائیہ نگار غیر رسمی انداز میں بے تکلفانہ اور آزادانہ طور پر اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ اس آزادانہ رویہ سے فکر اور مظاہر اشیاء کے نئے نئے روپ سامنے آتے ہیں۔ جب کوئی انسان آزادہ روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عادت و تکرار کے تھکا دینے والے دائرے سے باہر نکلتا ہے تو اس کے لیے زندگی میں حیرت و استعجاب کے نت نئے سامان مہیا ہوتے ہیں۔ اس کی فکر و سوچ کو ہر موقع پر مہمیز لگتی ہے اور اس آزادہ روی کے نتیجہ میں وہ معاشرتی، نظریاتی اور اخلاقی دباؤ کے اعصابی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کر کے صحت مند انسان بنتا ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو انشائیہ نگاری کے لیے آزادہ روی کو ضروری خیال کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے انشائیوں میں بھی اس رویے کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انشائیہ ''کنگ فشر'' میں اس رویہ کی یہ مثال ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ کنگ فشر کے لیے آوارہ گردی کس طرح سود مند ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح آزاد منش رویہ کا حامل شخص کس طرح بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتا ہے۔

> ''مجھے کنگ فشر تالاب پر منڈلاتا نظر آنے لگا۔ اب مچھلیوں کی خیر نہیں۔ ساتھ ہی مینڈک اور کیڑے بھی ڈرے سہمے خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے نظر آئے۔ اور مائک پر آواز بلند ہوتی گئی۔ کنگ فشر کا اپنا تو کوئی راگ نہیں ہوتا۔ اس کی آواز سریلی تو نہیں ہوتی لیکن قابل سماعت ضرور ہوتی ہے۔ آوارہ گردی کنگ فشر کا پیدائشی حق ہے۔ اس تالاب سے اس دریا اس ندی سے اس نہر۔ غرض جہاں مچھلیاں دیکھی اپنا جادو چلا دیا۔ اس کی طبیعت سفاکانہ ہوتے ہوئے بڑی حد تک آوارہ گرد بھی کہلائی جاسکتی ہے۔ آوارہ گردی تو ہر ذی روح کا بھی حق ہے اور قدرت کا بڑا انعام بھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس انعام کو کون کہاں اور کیسے استعمال کرتا ہے۔ اگر انسان کی فطرت میں آوارہ گردی نہ ہوتی تو سقراط، ارسطو، سکندر، ابن بطوطہ، واسکوڈی گاما جیسی عظیم شخصیتیں تاریخ میں اپنا نام سنہری حرفوں سے نہیں لکھواتیں۔ واسکوڈی گاما کی آوارگی نے تو وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ دنیا جتنی حیران ہے اتنی ہی پریشان بھی ہے۔ آزادہ روی اور روایات سے بغاوت صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو آہنی کلیجہ اور کول مائنڈ رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی نئی پگڈنڈی بناتے ہیں جس پر صرف صاحب ذہنیت ہی اپنے قدم جما سکتے ہیں۔''

(ہاجرہ بانو، ڈاکٹر، کنگ فشر، بحوالہ؛ باغ بہشت (انشائیوں کا مجموعہ)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014، ص۔ 31-32

نکتہ آفرینی اور بات میں سے بات پیدا کرنا انشائیہ کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ موضوع کے مخفی مفاہیم تک رسائی اور بات سے بات پیدا کرنا ڈاکٹر ہاجرہ بانو کے متذکرہ بالا اقتباس میں واضح نظر آتا ہے۔ نکتہ آفرینی کا یہ انداز ان کے باقی انشائیوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ بات میں سے بات پیدا کرنے کا یہ رویہ ان کے انشائیے ''بسیار خوری'' میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس انشائیہ کا اصل موضوع معاشرے میں پائے جانے والے مختلف بسیار خور ہیں لیکن دیکھیے انشائیہ کے آخر میں ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے کس طرح بات میں سے بات پیدا کی اور ڈرامائی انداز میں موجودہ دور کی مہنگائی کو نشانہ بنایا:

> ''۔۔۔ صاحب میرا کیا ہے۔ نکالیے پانچ ہزار روپے صرف دیسی گھی کے لیے۔ پندرہ پندرہ کلو بادام اور پستے میں ہمیشہ کی طرح دکان سے ادھار لاؤں گا۔ اور مصالحے میں..... بس بس۔ خان صاحب کھانستے چلائے "نامعقول اتنی مہنگائی کے زمانے میں بادام، پستے اور دیسی گھی کی بات کرتا ہے۔ جاؤ جاکر مونگ کی دال کی کھچڑی بناؤ۔ ہاضمے کے لیے بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔" نوکر نے بھی خوش ہوکر یہ شعر پڑھا۔ ہاں صاحب
>
> مہنگائی کی بہار ہے اپنے عروج پر
>
> اب بک رہی ہے دال بھی مرغی کے بھاؤ میں''

(ایضاً، ص۔ 27-28

ڈاکٹر ہاجرہ بانو اپنے انشائیوں میں عصری آگہی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ انشائیہ ''بسیار خوری'' میں انھوں نے

بسیار خوروں کی متعدد اقسام پر انشائی نظر ڈال کر معاشرے کے مختلف گوشوں کو سمیٹ لیا ہے۔ دیکھیے انشائیہ ''بسیار خوری'' میں پہلی قسم کے بسیار خور مرزا صاحب کی لمبی ڈکار کے بعد ناشکرے بندوں کے ذریعے سے ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے جس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، آج کے مسلم معاشرے کی سچائی یہی ہے:

> ''بسیار خور کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ اول قسم کے تو وہ ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں یعنی سو فی صدی بسیار خور ہونے کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے کسی بھی قسم کے کھانے کی پلیٹ یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس کے ذائقے میں کسی قسم کا کوئی نقص یا مین میخ نہیں نکالا جائے گا۔ اس کو صرف ہاضمہ کے عمل سے گزرنا ہے۔ اور دنیا میں آنے کے بعد آدم وحوا کے لیے اس کے تمام فرائض کی اب تکمیل ہو چکی ہے۔ مرزا صاحب اس معاملے میں ہمارے محلے کی ناک اونچی کیے ہوئے ہیں۔ وہ نہایت سرخروئی کے ساتھ ہر دعوت میں براجمان ہوتے ہیں اور پہلی صف سے آخری صف تک نہایت ہی خوش اسلوبی سے تمام مہمانوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی غذا کے مختلف فوائد پر ان کے مفید لیکچرس سے ان سب کی معلومات میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ آخری صف میں اچھی طرح تناول طعام کے بعد لمبی سی ڈکار لیکر آسمان کی طرف بلند آواز میں ''الحمدللہ'' کچھ اس طرح کہتے ہیں کہ دعوت ہال میں موجود تمام ناشکرے بندے بھی سن لیں جنہوں نے سورہ رحمان کی باغور و باترجمہ تلاوت نہ کی ہو۔ مرزا صاحب نے یہ طریقۂ شکرانہ بچپن ہی میں چڑیوں اور مرغیوں سے اپنایا تھا جسے وہ آج تک صدق دل سے بجاتے آئے ہیں۔''

(ایضاً ص۔24-25)

انشائیہ کی جملہ خصوصیات میں عدم تکمیل ایک اہم خصوصیت ہے۔ چونکہ انشائیہ میں غیر رسمی طریق کار اپنایا جاتا ہے اس لیے اس میں نہ دلائل سے کام لیا جاتا ہے اور نہ ہی حقائق کی روشنی میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے بلکہ اس میں انشائیہ نگار کے ذہنی تاثرات بے تکلف انداز میں رواں ہو جاتے ہیں جس وجہ سے انشائیہ میں بہت سے پہلو تشنہ اور نامکمل رہ جاتے ہیں۔ اس لیے انشائیہ کے قاری کو تشنگی اور عدم تکمیل کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کسی بھی خیال، مسئلے یا کسی بھی بات سے انشائیہ کی شروعات کر سکتا ہے اور کہیں بھی اور کسی بھی بات یا مسئلے پر انشائیہ کو ختم کر سکتا ہے لیکن اس کے درمیان وہ کئی اور موضوعات، خیالات اور مسائل پر بحث کرنے لگتا ہے اور پھر ادھورا یا تشنہ چھوڑ دیتا ہے، جس وجہ سے اس میں قاری کو بے ترتیبی کے ساتھ ساتھ عدم تکمیل کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو ایک ہی انشائیہ میں متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں جس وجہ سے ان کے انشائیوں میں بھی عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ انشائیہ نگاری کی اس تکنیک کو ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے بڑی خوبصورتی اور مہارت سے برتا ہے۔ ''کنگ فشر''، ''آل از ویل'' اور ''دائرہ دھنک'' انشائیے اس لحاظ سے سرفہرست ہیں۔ انشائیہ ''کنگ فشر'' میں مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ کی داخلی روشنی کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو علامتی انداز میں سرکاری عہدہ داروں، افسروں اور ذمہ داروں کو کنگ فشر کا خطاب دے کر ان کے ذریعے سے مظلوموں اور سرکاری اداروں کی خستہ حالی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتی ہیں۔ اس انشائیہ میں علامتی انداز اپنا کر وہ موضوع کے حوالے سے قاری کو مزید سوچنے کا سامان فراہم کرتی ہیں اور نئی اور پراسرار پگڈنڈی پر چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اس طرح اس انشائیے میں کئی زاویے ایسے در آتے ہیں جو فکر کو نیا پیکر عطا کرتے ہیں۔ طنز کی تیزی اور مزاح کی تلخی سے پر یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''کبھی شیئر بازار کا بیل سرپٹ دوڑتا ہے اور کبھی تو ایسا سہم جاتا ہے کہ جیسے قصاب کی چھریاں نظروں کے سامنے آگئی ہوں۔ کنگ فشر کے خاندان کی ساری انواع پوری دنیا میں کم وبیش نظر آتی ہیں چاہے امریکہ ہو یا ملیشیا۔ عرب امارات ہو یا یوروپ کے سمندر۔ غرض کنگ فشر اپنے چمکیلے اودے اودے پروں کے ساتھ پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور اپنے سر بکھرے چھوٹے چھوٹے پروں کو ہلاتے ہوئے صوفیانہ انداز سے دنیا کو یہ بتاتا ہے کہ سیارہ زحل کے دائروں کی طرح میری اڑان کے دائروں کا شکنجہ بھی بہت بڑا ہے۔ جس کسی کو بھی اپنے فرائض کی کوتاہی میں ملوث پاتا ہوں فوراً اسے دبوچ کر مالک حقیقی کا احساس دلا دیتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مچھلی اپنی ترکیب کی بدولت کنگ فشر کی سیاہ مضبوط چونچ سے پھسل کر دوبارہ نئی زندگی بھی پالیتی ہے جیسے نو سو چوہے کھا کر بلی حج کر کے اپنے گناہ معاف کروالیتی ہے۔ مندروں، مسجدوں اور درگاہوں میں ماتھا ٹیک کر اور دوزانو ہو کر عقیدت کے پھول چڑھا کر انسان اپنے دانستہ گناہوں کا وزن کم کر کے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے اور جلد ہی دوبارہ گناہوں کا وزن بڑھانے کی تیاری میں جٹ جاتا ہے۔

کیوں کہ اچانک کم ہوا وزن بھی انسان کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا ہے نا۔" (ایضاً،ص۔30)

ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اپنے انشائیوں میں عصری آگہی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی۔اس جدید صنعتی دور میں رشتے، آپسی تعلق اور بھائی چارہ سب شکست وریخت کا شکار ہیں۔ڈاکٹر ہاجرہ بانو اپنے عصر کے سیاسی اور سماجی حالات سے آنکھیں بند نہیں کرتیں بلکہ ان کی آنکھیں خیمۂ خواب میں تعبیر کو تعمیر ہوتے دیکھنا چاہتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ بھائی چارہ اور رشتوں کی شکست وریخت اور قتل وغارت گری پر بات کرتی ہیں تو ان کے قلم سے "جشن چراغاں" جیسا انشائیہ معرض وجود میں آتا ہے۔عصری آگہی سے بھرپور انشائی مزاج اور انشائی فضا کی تشکیل دیکھیے:

> "سنتے ہیں کہ جشن چراغاں ہماری گنگا جمنی تہذیب کی ایک منور مثل ہے۔کیوں کہ ہم نے تو جب سے اس دنیا پر اپنی سیاہ آنکھوں سے پہلی نظر ڈالی تو گنگا کو جمنا کے مختلف سمت میں ہی بہتے ہوئے دیکھا۔خیر دونوں کہیں بھی بہیں، پانی ہے۔جدھر چاہے اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ ہندوستان کی دونوں آنکھیں اپنے تہواروں پر مل جل کر چراغاں کرتے تھے۔آج کل کے چراغوں نے خود کو صرف اکثریت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ سیاسی تیل ان میں بھی تو پڑا ہے۔زمانہ جیسے جیسے چکا چوند اور دھوم دھڑاکے میں تبدیل ہوتا گیا درہم اور موہک روشنی نے بھڑکیلی چمک اور دل بہلانے والی آواز میں خود کو ڈھال لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریک فلک کو نور بخشنے کے ساتھ ہماری سماعت کے پردوں پر بھی چند شرارے چھوڑ جاتی ہیں۔ ایک فلیٹ میں دھڑا دھڑ گولیاں پستول سے نکلیں اور دو افراد ملک عدم سدھار گئے۔سب نے سمجھا کہ نئے سال کے جشن میں پٹاخے اڑائے جا رہے ہیں انھوں نے بھی مزید دو دھماکہ خیز راکٹ آسمان کی طرف داغ دیئے۔
>
> اے فلک کیا تیرے دامن میں ہی ستارے ہیں
> آ دیکھ ادھر میرے ہاتھوں میں بھی شرارے ہیں"

(ایضاً،ص۔41)

ہاجرہ بانو کے ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز نگارش ان کے تمام انشائیوں میں نظر آتا ہے۔اپنے انشائیوں میں وہ قاری کو برانگیخت کرتی ہیں، موضوع کے ساتھ گہری وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور موضوع کے انوکھے گوشے اجاگر کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔موضوع کے کیے انوکھے اور خوش رنگ گوشے ان کے انشائیوں جیسے دائرہ دھنک، ای۔جنریشن، آل از ویل، چاند کی مرضی وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔موضوع کے نئے زاویئوں سے نیا جہاں پیدا کرنا انہیں خوب آتا ہے۔وہ بے معنویت کے برعکس معنویت کا حسن بے پایاں بیان کرتی ہیں اور تجربے اور مشاہدے کو بوقلمونی عطا کرتی ہیں۔

انشائیہ "دائرہ دھنک" سوچ کے کئی دروازے کھولتا ہے۔ یہ انشائیہ پڑھنے کے بعد دماغ بھی ایک گول دائرے کی طرح گھومنے لگتا ہے۔ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے ایک چھوٹے سے لفظ "دائرہ" کو اتنی وسعت دی کہ ہاتھوں کی انگوٹھی سے لے کر نظامِ شمسی کو بھی اس میں سمیٹنے کی کامیاب کی کوشش کی۔"ای۔جنریشن" بار بار پڑھنے کو کی دعوت دیتا ہے۔اگرچہ انھوں نے اسے انشائیہ کے ذیل میں رکھا ہے لیکن میرے خیال سے اسے مزاحیہ مضمون ہی کہنا چاہیے کیوں کہ اس میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔"آل از ویل" میں بھی انھوں نے مزاحیہ انداز ہی اپنایا لیکن یہاں انھوں نے شگفتگی سے بہت کام لیا ہے۔اس انشائیے میں انھوں نے تساہل پسندوں، کاہلوں اور غیر ذمہ داروں کو خوب نشانہ بنایا اور بتایا ہے کہ کس طرح وہ ہر معاملے میں کہہ کر اپنا دامن چھڑاتے ہیں۔

غرض ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اپنی انشائیہ نگاری سے انشائی ادب میں آگہی کے نئے در وا کیے ہیں۔کئی ایسے گوشوں اور زاویوں کا انکشاف کیا ہے جن سے قاری متحیر بھی ہوتا ہے اور چونکتا بھی ہے۔اپنی محنت، ریاضت اور سعیِ پیہم سے انھوں نے انشائی کائنات میں اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں نئی زمین سر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔انفرادی اور تخلیقی لگن کا ثبوت دیتی ہیں۔خود انکشافی کو سطح پر ابھارتی ہیں اور معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں سوچ کو عصری آگہی عطا کرتی ہیں۔ڈاکٹر ہاجرہ بانو تخلیق کے نئے آفاق کی جستجو میں سرگرداں ہیں، نئی نسل میں اپنی انفرادی شناخت بنا رہی ہیں۔انہیں ابھی مزید بلندیوں اور کامرانیوں پر اپنا تخلیقی آشیانہ بنانا ہے جس کے لیے انہیں اپنی اس کاوش میں تسلسل اور تحرک کو برقرار رکھنا ہوگا۔

□□□

Mr. Mukhtar Ahmad Mir
Research Scholar
S/O : Ab. Rahman Mir
R/O. Kandoora, Tehsil : Beerwah
District : Budgam-193411 (J & K)
Mob: 7006418647

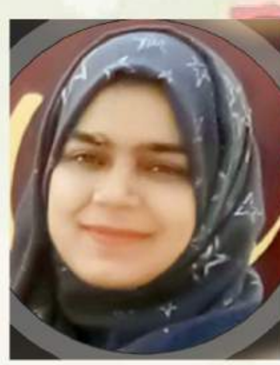

ایمن تنزیل

سن دلی!
سنا ہے اب تو نیند کی پیاری وادی میں
سکون کی چادر اوڑھے
دنیا سے بے پرواہ کہیں آرام کر رہی ہے؟
چل ٹھیک ہے
تو اب کچھ دن آرام کر
تیرے سینے میں صدیوں خنجر گڑھے رہتے ہیں
تیرے وجود کی لہلہاتی فصلوں کو سب اجاڑا کرتے ہیں
تو پھر بھی سب سے خندہ پیشانی سے ملتی تھی
پیٹھ میں اپنی ستم ظریفوں کے وار سہتی تھی
تیری پیشانی پر نیلا گگن جب سیاہی اوڑھنے لگا
تیرے ساتھ بہنے والے دریا کی سطح
تیز دھوئیں کی کلوچ سے بدرنگ ہونے لگی
تیری رونقوں کو بے حسی سے کوٹا گیا
ہوا بھی سارے نظارے دیکھ رہی ہے

دلی!
کبھی دلبرداشتہ نہیں ہوتی؟
کتنی جنگوں کی خوفناکیاں اس کے اندر جذب ہیں
کتنی مرتبہ اجڑی پھر بسی
اب دل خون کے آنسو روتا ہے
دلی ایک آہ بھرتی ہے
ہوا سے ہم کلام ہوتی ہے
ظالم کی رسی ڈھیلی ضرور ہوتی ہے
جب حکمِ خداوندی ہوتا ہے
رسی زور سے کھینچ لی جاتی ہے
میں نے بھی عرضی لگائی ہے!
میرا آنچل اب صاف ستھرا ہے
میرے دریاؤں کا پانی نیلا اور روپہلا ہے
سکون کے اڑن کھٹولے پہ جب جب میں سوار ہوتی ہوں
چرند پرند ہمسایہ بن کر میرے
خوشی سے مدہوش ہوتے ہیں

پھر ہوا دلی کے ماتھے پہ نرم ہتھیلی رکھتی ہے
کہتی ہے
میں تیرے دکھ سے آشنا ہوں
آ تجھے تھپکی دوں
چل کچھ دن آرام کر لے!

دلی اداس گہری سانسیں بھرتی ہے
سوچتی ہے
قہقہوں کی پھواریں لوٹ آئیں
میری گلیاں کوچے اور بازار پھر آباد ہو جائیں!
ہوا جانتی ہے
دلی بڑے دل والی ہے!

Aiman Tanzeel
D/o Mr. Tanzeel Hasan Shamsi
Ghair Peepal Wala, Gali Akhlaq Khan,
Rampur-244901(U.P)
Mob: 9756707108

غزلیں

علیزے نجف

جواب جس کے ملے نہ اب تک چلو کہ اب وہ سوال کر لیں
کہ اس محبت کے زائچے سے حذف سب اپنے ملال کر لیں

سوا محبت کے ہم محبت کشوں کا کسب حیات کیا ہو
نہیں جو ہم نہ سہی چلو یہ محبتیں لازوال کر لیں

تو ابتدا ہے میں انتہا ہوں ادھورے اک دوسرے کے بن ہم
بغیر اک دوسرے کے خود ہی ہم اپنا جینا محال کر لیں

ترا ہی اعزاز ہے محبت کہ کیا سے کیا ہم یہ ہو گئے ہیں
ملے ہیں کیوں اتنی دیر سے ہم چلو اسی کا ملال کر لیں

کہا بہت کچھ مگر کسک ہے کچھ اور کہنے کی اب بھی دل میں
تو آؤ اس شدت محبت کو آج فرض و خیال کر لیں

قبول ہم کو نہیں محبت روایتی پیرہن زدہ سی
اصول اپنے نئے بنا کر وفاؤں کو بے مثال کر لیں

شعور دل لاشعوری احساس کے ہے زیر اثر یہ سچ ہے
چلو کہ اس لاشعور سے بھی روابط اپنے بحال کر لیں

Alizey Najaf
Saraimir
Azamgarh-276305 (U.P)

خوشبو پروین قریشی

اداس رہتے ہوئے مسکرانا پڑتا ہے
کہ زندگی میں . بہت کچھ چھپانا پڑتا ہے

مرے خدا مجھے اپنی پناہ میں رکھیو
ہر اک قدم پہ یہاں زخم کھانا پڑتا ہے

وہ میرے ناز اٹھائے گا کس طرح آخر
کہ خرچ کرنے سے پہلے کمانا پڑتا ہے

نکلنا ہوتا ہے ہر سمت جب اجالا ہو
تو شام ہونے سے پہلے ہی آنا پڑتا ہے

کہا کسی نے نہیں ہے کبھی ہواؤں کو
چراغ پھونک سے شاید بجھانا پڑتا ہے

اشارے دور سے ہوتے ہیں. ہر تعلق میں
کسی سے ملنا ہو تو پاس آنا پڑتا ہے

وہ روٹھ جاتا ہے خوشبو مرے رویے سے
ہر ایک بار مجھے ہی منانا پڑتا ہے

Khushboo Perween
K, 12 Third floor, Haji Colony
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
Pin,110025,New Delhi
Mob,7644096273

خیر النساء علیم

درد کی وادی میں بکھر گئے خواب!

''بنی موری ساج رہی ماں''، یہ گیت کیسٹ پر بار بار سنا جا رہا تھا، گو ابھی ڈھولکی نہیں رکھی گئی تھی؛ مگر گھر میں پہلی شادی ہونے کے سبب شادی بیاہ کے گیت کیسٹ پر چل رہے تھے۔

''کسی اور کے گھر سے گانوں کی اتنی تیز آوازیں آئیں تو کتنی بری لگتی ہیں......اور اپنے گھر میں یہ سب کتنا اچھا لگ رہا ہے'' سمیہ نے آنکھیں بند کر کے طمانیت سے سوچا۔

آج وہ اپنا فیشیل کروا کے آئی تھی، اس کی خوبصورتی اور بھی نکھر گئی تھی، اس کی نظریں بار بار آئینے کی جانب اُٹھ رہی تھیں، اس کا ذہن ایک انجانی خوشی سے سرشار تھا۔

جیسے جیسے شادی کے دن قریب آتے ہیں لڑکی کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو جاتی ہے، اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ، من چاہا ساتھی ملنے کی خوشی...... ایک ایسے دورَاہے پر لے آتی ہے کہ من بے کل سا ہو جاتا ہے......، وہ اپنی چھوٹی بہن ثانیہ کو بار بار سمجھا رہی تھی کہ اس کے جانے کے بعد اُسے امی اور ابا کا بے حد خیال رکھنا ہے، کہیں اس کے جانے سے وہ اکیلے ہی نہ ہو جائیں۔

''کسی کو کچھ نہیں ہوگا، آپی آپ بے فکر رہیں......'' ثانیہ نے ہنس کر کہا۔

''مگر میں تم سب کے لیے بہت فکر مند رہوں گی۔'' اس نے شش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ بہت زیادہ حساس ہیں ناں! اس لیے اتنا سوچ رہی ہیں،

شادی کے بعد آپ کو ہم میں سے کسی کا بھی خیال تک نہیں آئے گا، میری سہیلی کی باجی بھی یہی کہتی تھیں مگر شادی کے بعد تو وہ بس میاں اور سسرال میں مگن ہوگئیں.......“

”تم انٹر میں آگئی ہو، گھر کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، میرے بعد کیسے سنبھالو گی سب......؟ سوائے باتیں بنانے کے تمہیں آتا ہی کیا ہے؟“

”سمیہ آپی! میں ویسے ہی سب سنبھالوں گی جیسے سب چھوٹی بہنیں سنبھالا کرتی ہیں۔“

”بھئی یہ تو اچھی بات ہے، مگر کچھ ڈیشز میرے سامنے ہی سیکھ لو......!“

”آپی! بے فکر رہیے، جب آپ اور شایان بھائی آیا کریں گے ناں تو ڈائننگ ٹیبل نئی نئی ڈیشز سے بھری ہوئی ہوگی......میں تو ایسے کھانے کھلاؤں گی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں......“

”مگر تمہیں کوکنگ آتی کب ہے؟ کبھی باورچی خانہ میں جھانکتی تو ہو نہیں......!“ سمیہ کی فکریں دور نہیں ہو رہی تھیں۔

”یہ میں کب کہہ رہی ہوں کہ میں کھانے پکانے میں طاق ہو جاؤں گی......“ ثانیہ چڑانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”تو پھر کھانے کی میز پر کھانوں کی تصویریں سجاؤ گی؟“

”جی نہیں......! ہوٹل زندہ باد کے سنہری اصولوں پر عمل کروں گی، حلیم، چکن روسٹ، کباب، پراٹھا، نہاری اور پائے، سب میز پر سجے ہوں گے......“ ثانیہ کا انداز بے حد شاہانہ تھا۔

”خود پکانا نہیں سیکھے گی! امی کے بجٹ کا بیڑہ غرق کرے گی کیا......؟“

”آپی! شروع شروع میں رعب بھی تو جمانا ہوگا نا داماد جی پر؛ کہ ہم کیسے کیسے کھانے پکانا جانتے ہیں، بعد میں تو شایان بھائی کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ ہمارے ہاتھ میں کتنا ذائقہ ہے، کہ کچی پکی چپاتیاں حلق سے اتارنا کتنا مشکل ہے......“ ثانیہ شرارت بھرے لہجے میں اپنے پلان سنا رہی تھی اور مقدر ہنس رہا تھا۔

پھر وہ ہوگیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، سمیہ کی شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے......زیور بن کر آچکا تھا، کپڑے سل کر نائیلون کی تھیلیوں میں پیک ہوگئے تھے، دیگر کام بھی انجام پا چکے تھے۔

اچانک اس گھرانے کی خوشیوں کو نظر لگ گئی۔

جب انصاری صاحب پر اچانک فالج کا اٹیک ہوگیا، شادی پر خرچ ہونے والا پیسہ علاج کی نظر ہوگیا، وہ ایک ہاتھ پیر سے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے، جاب بھی پرائیویٹ تھی اور شاید باس بھی رحمدل انسان نہ تھے؛ یہی وجہ تھی کہ نوکری سے انھیں جواب مل گیا تھا، کہیں سے مالی مدد کی بھی توقع نہ تھی۔

سمیہ اسکول میں ٹیچر تھی اور گھر میں سب سے بڑی بھی......اس نے اپنی تنخواہ میں سے بہت سی چیزیں اپنے جہیز کے لیے بنائی تھیں اور اب جب وہ دولہن بننے جا رہی تھی گھر پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی......

”ان حالات میں اگر سمیہ کی شادی ہوگئی تو چھوٹی بہنوں کی کفالت کیسے ہوگی......؟ باپ کا علاج کیوں کر ہوگا؟ اگر شادی ہوگئی تو گھر میں فاقے کرنے ہوں گے، اب اسی کی تنخواہ کا آسرا ہے، اس کی شادی ہونے کی صورت میں کسی جانب سے کوئی امید نہیں ہوگی، امی ہر آئے گئے کے سامنے بس یہی بیَن کر کے رو رہی تھیں......، ان کے خیال میں گھر کو چلانے کی اب تمام تر ذمہ داری سمیہ کی ہی ہوگی، اس سے زیادہ کچھ سوچنا ان کے لیے غیر اہم ہی تھا، سمیہ اپنے آپ کو نادم سا محسوس کر رہی تھی۔“

ان حالات میں اگر سمیہ کی شادی ہوگئی تو چھوٹی بہنوں کی کفالت کیسے ہوگی......؟ باپ کا علاج کیوں کر ہوگا؟ اگر شادی ہوگئی تو گھر میں فاقے کرنے ہوں گے، اب اسی کی تنخواہ کا آسرا ہے، اس کی شادی ہونے کی صورت میں کسی جانب سے کوئی امید نہیں ہوگی، امی ہر آئے گئے کے سامنے بس یہی بیّن کر کے رو رہی تھیں......، ان کے خیال میں گھر کو چلانے کی اب تمام تر ذمہ داری سمیہ کی ہی ہوگی، اس سے زیادہ کچھ سوچنا ان کے لیے غیر اہم ہی تھا، سمیہ اپنے آپ کو نادم سا محسوس کر رہی تھی۔

”امی! میں نے شایان سے بات کی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ تم شادی کے بعد اپنے گھر کی مالی مدد کرتی رہنا۔“

سمیہ نے ماں کی پریشانی کم کرنے کی سعی کی......

''یہ سب شادی سے پہلے کی باتیں ہیں، بعد کو تو وہ اپنی تنخواہ سے زیادہ تمھاری کمائی کا حساب رکھا کرے گا، تم شایان کو فرشتہ نہ سمجھو۔''

''مگر امی! یہ بات انھوں نے خود ہی کہی ہے۔''

''میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے، میں سمجھ سکتی ہوں، تم سے شادی کر کے تو اس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔''

''مگر امی! وہ تو مجھ سے زیادہ پریشان ہیں، ہر وقت ہم ہی لوگوں کی باتیں کرتے ہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ جب تک ثانیہ اور سنبل پڑھ لکھ کر قابل نہ ہو جائیں تم اپنی تنخواہ امی کے ہاتھ میں دیا کرنا۔''

''ارے بڑا مکار ہے وہ! یہ بات تو میں پہلے ہی سے جانتی تھی...... ایسی ہمدردی کی باتیں وہ اس لیے کر رہا ہے کہ تم خود ہی کہیں شادی سے انکار نہ کر دو......''

''تو پھر کیا کریں امی......؟ آپ ہی بتایئے؟''

''شادی کو دو چار سال کے لیے ٹال دیا جائے......، اگر شایان کو تم سے محبت ہوگی تو وہ انتظار کرے گا......''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ! وہ اتنا عرصہ کیسے انتظار کر سکتا ہے؟ اب تو شادی کے سارے انتظامات ان کے گھر میں بھی ہو چکے ہیں۔''

''کیسی بیٹی ہے تو......؟ غیروں سے ہمدردی ہو رہی ہے، اپنا اپاہج باپ نظر نہیں آ رہا ہے......؟''

امی اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں، اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

''میں شادی نہیں کروں گی! اب آپ پریشان مت ہویئے، اس طرح رونے سے ابا بھی پریشان ہو جائیں گے......''

''اللہ! میری بچی کو خوش رکھنا، خدمت گزار بیٹیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں، جو اپنے ماں باپ اور بہنوں کی خوشیوں کو مقدم سمجھا کرتی ہیں، امی اُسے اپنے سینے سے لگائے دعائیں دے رہی تھیں۔

شایان نے سمیہ سے ملنے کی بہت کوشش کی، اس کے رشتے دار خواتین نے بھی آ کر امی کو بہت سمجھایا۔

''بھئی! میری بیٹی نے اپنے باپ کی طبیعت کی وجہ سے خود ہی منع کر دیا ہے، اب میں کیا کر سکتی ہوں؟'' امی کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا۔

تب شایان ایک دن اس کے اسکول چلا آیا اور سمیہ سے خود بات کی۔

''شایان! میرے اوپر بہت ذمہ داریاں ہیں، تم کسی اور کو اپنا شریکِ زندگی بنا لو!'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تم کہو تو میں تمھارا انتظار کر سکتا ہوں......''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ یہ عرصہ کتنے سالوں پر محیط ہوگا، اس لیے انتظار کرنے کے بجائے تم کسی سے شادی کر لو......!''

''تمھیں افسوس نہیں ہوگا؟'' شایان کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔

''مگر مجھے اس بات کی خوشی ہوگی کہ میں اپنے گھر والوں کے مسائل کم کرنے کا سبب بنوں۔'' سمیہ قصداً مضبوط لہجے میں بول رہی تھی، مگر اس کے دل کی کیفیت سے کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا تھا؛ جہاں ایک ماتم بپا تھا......شایان اس کے دور پار کا رشتہ دار ضرور تھا؛ مگر ان کی ملاقات ایک تصویروں کی نمائش میں ہوئی تھی، پھر شایان اسے اپنے خاندان کی ایک شادی میں نظر آ گیا......۔

''آپ یہاں کیسے......؟'' وہ اسے دیکھتے ہوئے پاس آ گیا۔

''ہماری ننھیالی رشتہ داروں کی شادی ہے، اس لیے ہم سب شریک ہوئے ہیں۔''

''اور میری تائی کے میکہ میں ان کی چھوٹی بہن کی بیٹی کی شادی ہے۔''

''ماشاءاللہ! بڑا قریبی رشتہ ہے......'' اُسے ہنسی آ گئی۔

تب اس نے سامنے سے آتی اپنی تائی سے نہ صرف سمیہ کا تعارف کروایا؛ بلکہ وہ ان کو لے کر سمیہ کی امی تک بھی پہنچ گیا، دور پرے کی رشتہ داریاں اتنی محبت سے جتائی گئیں کہ وہ بہت قریبی رشتہ دار نظر آنے لگے، اور پھر دو دن بعد ہی وہ اپنی اماں اور تائی کے ساتھ سمیہ کے گھر پر تھا، اماں اور تائی دونوں سمیہ کے رشتہ کی بات کر رہی تھیں......۔

یہ سب اچانک اور اتنی جلدی ہوا کہ سمیہ کو سمجھ نہیں آیا کہ یوں ایک بار کی ملاقات اتنی جلدی منگنی کا رشتہ جوڑ دے گی......، منگنی دونوں خاندانوں میں سادگی سے ہوئی، اور شادی ایک سال بعد ہونا طے پائی تھی۔

شادی میں صرف سات دن باقی تھے؛ جب سمیہ کے والد بیمار ہو گئے، جس کی وجہ سے ان کی نوکری بھی جاتی رہی، انہی وجوہات کی وجہ سے شادی ختم کر دی گئی اور اب تو شایان سے بھی آخری بات کر لی گئی تھی۔

کیا کمی تھی اس میں؟ خوبصورت، تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار لڑکی......! اس کی قسمت پر اس وقت سیاہی سی تھپ گئی جبکہ منزل دو چار ہاتھ ہی لبِ بام رہ گئی تھی، تقدیر کے فیصلے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کرتے۔

جاب کرنے والی بیٹیاں اگر گھر کی کفالت میں حصہ لیتی ہیں تو ان کی خوشیوں پر بجلیاں گرانے کا کسی کو حق نہیں،......اس کے جہیز کے جوڑے بڑی پیٹی میں ڈال دیے گئے،...... برتنوں کے سیٹ مچان پر رکھ

دیے گئے،...... باقی ساری چیزیں ڈبوں میں پیک کر دی گئیں۔

امی نے ہر کام میں جلدی کی، سوانھوں نے شایان کے پاس سے آیا ہوا منگنی اور عیدوں پر آیا ہوا سب سامان واپس بھجوا دیا، سمیہ کے دل پر گری بجلی کو کسی نے نہ دیکھا۔

رات کو کھانا کھلا کر دوا دینے کے بعد ابا نے سمیہ کا ہاتھ پکڑ لیا، ان کی آنکھیں نم سی ہوگئی تھیں۔

''سمیہ بیٹی! کیا میں کبھی صحت مند نہیں ہو سکتا......؟''

''بہت جلد آپ صحتمند ہو جائیں گے ابا! یہ مرض کوئی لاعلاج تھوڑا ہی ہے۔''

''پھر تمھاری ماں نے تمھاری شادی ختم کیوں کر دی؟'' وہ بے چارگی سے بولے۔

''ابا! آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں، اب آپ کی بیماری میں شادی ہوتی کیا اچھی لگے گی؟'' سمیہ نے زبردستی ہنس کر کہا۔

''تو بھی سوچتی ہوگی کہ باپ نے بے وقت بیمار ہو کر تیری خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔''

''نہیں ابا جی! اللہ آپ کو سلامت رکھے، آپ کے دم سے ہی میری خوشیاں ہیں۔''

''نہیں بیٹی! یہ کچھ اچھا نہیں کیا تیری ماں نے......! کیا سوچتا ہوگا؟ کیسے وعدہ خلاف لوگ ہیں، رشتہ طے کر کے آخری وقت میں ختم کر دیا......'' ابا جی نے اُسے غور سے دیکھا۔

وہ کمالِ ضبط سے کام لے رہی تھی......، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دل کا حال کسی پر بھی ظاہر ہو۔

''بدقسمت ہوں میں!...... جو میری بیماری کی وجہ سے میری بیٹی کی خوشیاں ملیامیٹ ہوگئیں......۔''

''یارب العالمین! مجھے ثابت قدم رکھنا، میرے وجود سے میرے گھر والوں کو خوشیاں عطا کرنا، میرے دل سے شایان کی محبت کو مٹا دینا؛ ورنہ میں ہمیشہ بے کل رہوں گی......۔''

کچھ دنوں بعد وہ اسکول کے گیٹ سے باہر نکلی تو شایان اس کا منتظر تھا، سمیہ نے اس کے قریب سے بیگانوں کی طرح گزر جانا چاہا، وہ پکار اُٹھا۔

''اب کیا میری بات سننے کے لیے بھی تمھارے پاس وقت نہیں ہے......؟''

''جی فرمائیے......!'' اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''تم اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی نہیں کر سکتیں......؟''

''نہیں......!''

''وجہ......؟''

''میری قسمت میں شاید یہی لکھا تھا......۔''

''تم غلط سوچتی ہو، میں ہوں نا تمھارے ساتھ......'' وہ اس کے عین مقابل کھڑا تھا۔

''اگر ایسا ہوتا تو ابا جی یوں یکا یک بیمار کیوں ہوتے؟''

''یہ دُکھ یہ سُکھ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، ان کو اپنے اوپر حاوی مت ہونے دو۔''

''فی الحال تو مجھے اپنے گھر والوں کے لیے بہت کچھ کرنا ہے، ان سے نمٹوں گی تو اپنے لیے بھی ضرور سوچوں گی......۔'' اس نے آگے کی جانب قدم بڑھائے جیسے وہ کچھ سننا نہ چاہتی ہو۔

''بس ایک منٹ اور......''

''جی! وہ بھی کہہ دیں......'' اس نے اپنے آگے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔

''سمیہ! میری یہ بات تم ہمیشہ یاد رکھنا، اپنی ذات سے کبھی غافل مت ہونا......۔''

''جی بہت اچھا......!''

''تمھاری اماں نے تمھیں بیٹی کے بجائے سپاہی بنا دیا ہے...... تم ہمیشہ اپنے گھر کے لیے سپاہی مت بنی رہنا......۔''

سمیہ کے سینے میں تیر کی طرح یہ بات لگی...... اور وہ تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔

''ہونہہ......! پاگل کہیں کا، آیا تھا مجھے بہکانے کے لیے، جیسے میں اس کی بات مان ہی جاتی، دنیا کی بیٹیاں بیٹوں سے بڑھ کر اپنے والدین اور بہنوں کا خیال رکھتی ہیں، ایک میں نے خیال کر لیا تو کون سی نئی بات ہوگئی......۔''

اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے ٹیوشنز شروع کر دیے، اسکول سے آکر وہ کھانے سے فارغ ہو کر نماز پڑھتی، پھر ٹیوشن پڑھنے والی لڑکیاں گھر میں آنا شروع ہو جاتیں اور یہ سلسلہ مغرب کے بعد تک چلتا رہتا۔

امی اس کے اس ایثار سے بہت خوش تھیں، تب سمیہ اپنے آپ کو بے حد مطمئن پاتی، اس کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا، اگر شایان سے اس کی شادی ہو جاتی...... تو اس کے والدین بھوکوں مرجاتے......، ابا جی کا علاج نہ ہو پاتا، چھوٹی بہنوں کی تعلیم چھوٹ جاتی، آج امی جو یوں پرسکون نظر

آتی ہیں، ہردم پریشان رہتیں، ...... آنسو ان کی آنکھوں میں مستقل ٹھکانہ بنالیتے۔

"آج بہت گرمی ہے، ایسا لگ رہا ہے آسمان آگ برسا رہا ہے۔" گھر میں داخل ہوتے ہی سمیہ کا صبر جواب دے گیا۔

"روز ہی جیسی گرمی ہے، جب تک نہاؤ نہیں چین نہیں پڑتا۔" ثانیہ جو ابھی نہا کر نکلی تھی اپنے بال سلجھاتے ہوئے بولی۔

"تم آج کالج نہیں گئیں کیا؟ اس وقت گھر میں کیا کر رہی ہو......؟"

"نہیں! اماں نے منع کر دیا تھا آج کالج جانے کو......" ثانیہ نے کچھ شرماتے ہوئے بتایا۔

"آج نواز صاحب کی بیگم اور ان کی بیٹیاں آئیں گی ہمارے گھر، وہ آج ثانیہ کو دیکھنے کے لیے آرہے ہیں......" اماں کے لہجے میں مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔

شام کو نواز صاحب کی فیملی مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کے ساتھ کپڑوں کا جوڑا اور انگوٹھی بھی لے آئے تھے، ان سب چیزوں کو دیکھ کر سمیہ کچھ بوکھلا سی گئی۔

"ارے! اتنی تکلف کی کیا ضرورت تھی......؟ میں نے کہا تھا کہ آپ آکر منہ میٹھا کر دیجیے......" اماں خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"ہم منہ میٹھا ہی تو کرنے آئے ہیں......، پہلی بہو ہے ہماری! بہت ارمان ہیں ہمارے دل میں......"

اس شب کھانے پر بہت اہتمام کیا گیا تھا...... ساس نندوں کو کپڑے علاحدہ دیے گئے تھے...... دولہا کے لیے ایک عمدہ قسم کا سوٹ کا کپڑا، پرفیوم کے سٹ کے ساتھ دیا گیا تھا...... چلتے وقت انھوں نے یہ کہا کہ آئندہ ہفتے آپ لوگ بھی دولہا کو انگوٹھی پہنانے آجایئے،...... تو سمیہ پریشان سی ہوگئی، ہر طریقہ سے اس بات کو ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر لڑکے والے کسی طور پر مانتے ہی نہ تھے،...... تب اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اگلے ہفتے آنے کی ہامی بھر لی۔

اگلے ہفتہ وہ لوگ نواز صاحب کے گھر گئے تھے، مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے دُگنے کر کے لے جانا پڑا تھا......، دولہا کو پہنائی گئی انگوٹھی بھی ان لوگوں کو پسند نہ آئی، ان حالات میں دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ یا اللہ یہ شادی خیر و عافیت سے ہو۔ آمین

سمیہ سونے کی کوشش کر رہی تھی، مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، برابر کے پلنگ پر اس کی سب سے چھوٹی بہن سنبل سو رہی تھی، گہری نیند میں تھی، ایک ملکوتی مسکراہٹ لبوں پر تھی، دفعتاً وہ بڑبڑانے لگی۔

"کہہ دیا ناں...... ہرگز نہیں!...... پلیز افراز!...... میری بات مان جاؤ۔"

سمیہ نے حیران ہو کر دیکھا، اُسے سوتے میں بولنے کی عادت تو کبھی نہیں تھی۔

"سنبل اٹھو......!" سمیہ بے تابانہ انداز میں اس کو اُٹھا رہی تھی۔

"آپی! میں بہت اچھا خواب دیکھ رہی تھی، آپ نے خواہ مخواہ جگا دیا......"

"اس لیے جگا دیا کہ بہت سے خوابوں کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔" حسرت بھرے لہجے میں کہا گیا۔

"اللہ نہ کرے!" وہ بے اختیار کہنے لگی۔

"اچھا! بتاؤ تم کیا خواب دیکھ رہی تھیں......؟ میرا خیال کہ بہت خوبصورت خواب تھا، ہے ناں......"

"نہیں آپی! ایسی کوئی بات نہیں ہے جو میں آپ کو بتاؤں......"

"ٹھیک ہے! شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مگر افراز کون ہے؟"

"آپ کو کس نے بتایا......؟" وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"آپی وہ میری دوست کے بھائی ہیں، بینک میں کام کرتے ہیں۔"

"پھر تم کیا چاہتی ہو سنبل؟ کیا تم بھی انھیں پسند کرتی ہو......؟"

"جی آپی! افراز تو اپنی امی کو ہمارے گھر رشتہ کے لیے بھیجنے والے تھے، مگر میں نے منع کر دیا؛ کہ ابا کو فالج کا اٹیک ہوا ہے، اس کے علاوہ میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں۔"

"تم نے کیوں منع کر دیا انھیں......؟" سمیہ کو اس کی معصومیت پر پیار سا آنے لگا۔

"آپی! آپ کی منگنی بھی تو اسی وجہ سے توڑی گئی، تو پھر میں کیوں آنے کو کہتی؟"

"تمھارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا......"

"کیوں آپی......؟"

"اس لیے کہ تمھارے کندھوں پر گھر کا بوجھ نہیں ہے، اچھا ہے کہ تمھارے فرض سے بھی جلد فارغ ہوجائیں، تم افراز سے کہو کہ وہ اپنی امی کو بھیجیں، اگر لڑکا اچھا ہے تو اس کے بارے میں سوچیں گے۔"

"مگر ابھی پچھلے ہفتے ہی چھوٹی آپا یعنی ثانیہ کی منگنی ہوئی ہے، ان حالات میں یہ سب کیسے ممکن ہو سکے گا......؟"

''یہ باتیں تمھارے سوچنے کی نہیں ہیں......۔''

چند دن بعد فراز اپنی امی اور بہنوں کے ساتھ آیا تو سب کو ہی اچھا لگا، ان لوگوں کے کوئی خواہشات یا مطالبات نہیں تھے، لوگ بھی بہت ہمدرد اور ہنس مکھ تھے، سوچٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوگیا تھا۔

''مگر تیاری......؟'' سمیہ پریشان ہورہی تھی۔

اس مہنگائی کے دور میں بیٹیاں بیاہنا کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہوتا ہے، وہ تو لڑکا شریف تھا جس نے سنبل کو پسند کرنے کے بعد شادی کے لیے کہا تھا، سنبل چھوٹی ضرور تھی مگر اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی۔

''غیر لوگ ہیں رشتہ کرنے کے بعد مکر بھی سکتے ہیں، اس لیے جتنا جلد شادی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔''

''امی! آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، آپ لڑکے والوں سے جتنی جلدی شادی کی تاریخ لے سکتی ہیں لے لیں؛ تاکہ ہم اس کے بھی فرض سے سبکدوش ہوجائیں......۔''

''یہی تو میرا بھی خیال تھا......'' اماں اس کو اپنا ہم نوا پاکر خوش ہوگئیں اور لگیں اس کو دعائیں دینے......۔

''اللہ! میری سمیہ کے لیے بھی کوئی اچھا سا شہزادہ بھیج دے،...... ایسا نیک ہو جو اسے پھولوں کی طرح رکھے، میری سمیہ زندگی میں ہر وہ سکھ پائے جس کے لیے لڑکیاں آرزو کرتی ہیں......۔''

اور سمیہ اپنے لبوں پر ایک پھیکی سے مسکراہٹ سجا کر ان کے سامنے سے ہٹ گئی، اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔

اس کے من کا شہزادہ تو واپس جاچکا تھا......، بلکہ واپس بھیج دیا گیا تھا، وہ ایک سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

وہ فری پیریڈ میں چھوٹی بہنوں کی شادی کی تیاری کے بارے میں بات کررہی تھی، مسز ملک کو شاپنگ کرنے کے اچھے طریقے اور بازاروں کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتی تھیں، اس کی باتیں سنتے ہوئے مسز ملک سمیہ سے پوچھ رہی تھیں:

''سمیہ! تمھاری ماں کے اپنے ہی بچوں میں دو قانون ہیں، تمھاری چھوٹی بہنوں کے لیے الگ قانون ہے اور تمھارے لیے الگ......''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی......؟''

''تمھارے والد کی نوکری ختم ہوجانے کے باعث تمھاری شادی اسی وجہ سے کینسل ہوگئی تھی کہ تم سپورٹ کررہی ہو، اور اب اتنی چھوٹی عمر میں دوسری بیٹیوں کے رشتے طے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کے لیے بھی تو کچھ وقت لے سکتی تھیں ناں؟ تم سمجھ رہی ہو میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں......؟''

''مسز ملک!! آپ میرے گھر کے حالات سے ناواقف تو نہیں ہیں، میری والدہ بہت جلد پریشان ہونے والی خاتون ہیں،...... ان کا خیال بلکہ خواہش ہے کہ وہ اپنے فرض سے جلد از جلد فارغ ہوجائیں، تو وہ آتے ہوئے اچھے رشتے کیوں لوٹاتیں؟'' سمیہ نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا......

''تو ایک ساتھ دونوں کی شادیاں ہوجانے سے امی اطمینان محسوس کریں گی۔''

''تو کیا تمھاری امی نے تمھیں لڑکا سمجھنا شروع کردیا ہے......! جو وہ تمھارے بجائے تمھاری چھوٹی بہنوں کی شادیاں پہلے کرنا چاہتی ہیں، کیا تمھارے بارے میں وہ نہیں سوچ سکتیں......؟''

''امی سمجھیں یا نہ سمجھیں......مگر میں نے اپنے آپ کو واقعی لڑکا سمجھنا شروع کردیا ہے، چھوٹی بہنوں کی شادی کی ذمہ داری میری ہے۔'' سمیہ کا لہجہ پُرجوش ہوگیا۔

''تو پھر تمھاری زندگی انہی کاموں میں گزر جائے گی......۔'' ایک ٹھنڈی آہ بھر کر مسز ملک اُسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھیں۔

''اگر میری کاوشوں سے میری چھوٹی بہنیں شاندار طریقے سے بیاہی جائیں تو یہ میری خوشی ہوگی،......ابا جی کی معذوری ختم ہوجائے تو یہ میری طمانیت ہوگی، تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے......، میں میری تن تنہا زندگی......اتنے لوگوں کے کام آئے گی تو مجھے بھی سکون ملے گا،...... ماں باپ اور میری چھوٹی بہنیں، غیر تھوڑی ہیں، جن سے خون کا رشتہ ہو اُن کا حق تو ہوتا ہی ہے ایک دوسرے پر،...... یہ اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے خاندان کے کام آرہی ہوں......۔''

تو وہ ہلکی پھلکی ہوکر ہنسنے لگی اور مسز ملک اس معصوم سی لڑکی کے ڈھیروں مسائل پر غور کرتی ہوئی اپنی کلاس لینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

ایسی لڑکیاں جو اپنی زندگی کو اپنی خواہشوں کو اور اپنی خوشیوں کو نہ دیکھیں، وہ واقعی قابلِ تعظیم ہوتی ہیں۔

□□□

Khairunnisa Aleem
H.No: 16-2-141/B
Flat No: 301,
Near Officers Mess, Malakpet
Hyderabad. 500036. T.S.

اُنزلہ معین الدین

لاڈلی

وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی مسلسل گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی اُس اندھیرے خاموش کمرے میں سوائے گھڑی کی ٹِک ٹِک کے اور کوئی آواز نہ تھی۔وہ اپنی زندگی کے اٹھائیس سال گزار چکی تھی اوران اٹھائیس سالوں میں اُسے کبھی موقع ہی نہ ملا کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچ سکے۔اتنے سالوں میں اُس نے کیا پایا۔۔۔کیا کھویا۔۔۔کتنے دوست بنائے اور کتنے دُشمن۔۔۔۔۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا وہ گھٹنوں میں اپنا چہرہ ڈالے اپنی زندگی کو پہلے دِن سے سوچنا چاہتی تھی۔

وہ نومبر کی صبح تھی سردیوں کی خوبصورت صبح ۔۔۔۔ پودوں کے پتوں پر منجمد شبنم کی بوندیں۔۔۔ٹھنڈی ہواؤں سے لُطف اندوز ہوتے پرندے آسمانوں میں سمٹے نظر آرہے تھے۔سورج کی تپش نہ کے برابر تھی۔ ایسی ہی ایک خوبصورت صبح اس نے جاگیردار گھرانے میں آنکھ کھولی اور سب کی لاڈلی ہوگئی۔

دھیرے دھیرے وقت گزرا،وہ بڑی ہو کر چلنا سیکھ گئی، پر جہاں تک اُسے یاد ہے اس نے آج تک زمین پر اپنے قدم نہیں رکھے۔جب بھی چلنے کے لیے پیر آگے کرتی مخمل کے فرش بچھا دیے جاتے۔۔۔جہاں جاتی تعریفوں کے پُل باندھ دیے جاتے۔۔۔ پورے خاندان میں اس کے جیسی خوبصورتی کی مثال کوئی قائم نہ کر سکا۔

چند سال اور گزر گئے اسکول جانے کا وقت آ گیا، باپ اور بڑے بھائیوں نے سب سے بہترین معلم کو حویلی بلوالیا،اسکول کی مکمل تعلیم حویلی

ہی میں دی گئی۔ وہ اپنی نازوں سے پلی بیٹی کو ہر چیز سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چاہے وہ موسم کی سختی ہو یا دُنیاوی شر۔۔۔

اسکول کی تعلیم شروع ہوتے ہی خاندان والوں کو علم ہوا کہ نہ صرف ان کی بیٹی خوبصورت ہے بلکہ پڑھائی لکھائی میں بھی بہت ذہین ہے۔ اسکول کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اس نے اپنے بڑے بھائیوں سے آگے بڑھنے کی خواہش بھی ظاہر کی جو کہ انتہائی مشکل سے پوری ہوئی۔

کالج میں وہ اپنی خوبصورتی اور ذہانت کے سبب بہت ہی کم عرصے میں مشہور ہوگئی۔ کالج کا آدھا سال گزر گیا اِن دِنوں والد محترم کی طبیعت ناساز رہنے لگی، انھوں نے اپنی لاڈلی نازوں سے پلی بیٹی کی شادی کے لیے اپنی آخری و پہلی خواہش ظاہر کی۔ جس کو سنتے ہی بڑے بھائیوں نے اپنی تلاش شروع کردی۔

اِن دنوں وہ سُرخاب کے پَر لگا کر اُڑنے لگی۔ ہر لڑکی کی زندگی میں یہ موڑ آتا ہی ہے۔ جس کے خواب وہ ہوش سنبھالتے ہی دیکھنے لگتی ہے اور اس خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔

بڑے بھائیوں کی سخت محنت کا نتیجہ کھل کر سب کے سامنے آیا اور تقریباً ایک سال کے طویل عرصے کے بعد برادری سے تعلق رکھنے والے شخص سے اس کا رشتہ طے ہوا۔

(2)

وہ دیکھنے میں خوش مزاج۔۔خوش شکل۔۔کسرتی جسم اور بے انتہا دولت کا مالک۔۔۔ ہر اس چیز کا مالک جس کا خواب اُس نے دیکھا تھا۔۔ ہر اس چیز پر اختیار جو باپ اور بھائیوں نے چاہا تھا۔

ہمیں زندگی میں ہر وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کی کبھی بھی ہمیں ضرورت محسوس نہیں ہوتی، ہم اکثر ان ہی چیزوں کی طلب کرتے ہیں جو ہمیں حاصل نہ ہو۔

بڑی ہی دھوم دھام سے ایک ایک رسومات ادا کی گئی، پورے گاؤں کو دُلہن کی طرح سجایا گیا، ہر کسی کو اس شادی کی خاص دعوت دی گئی امیر سے امیر لوگوں کو مدعو کیا گیا، غریب سے غریب لوگوں کے لیے بھی دعوت وطعام کا نظم کیا گیا۔ کل پندرہ دِنوں کے مکمل فنکشن کے بعد نکاح خوانی والا دِن آیا۔

وہ شیشے کے سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی کبھی خود کو دیکھتی تو کبھی شرما کر نظریں جھکا لیتی۔ پورا کمرہ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا، کبھی کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ۔

''ماشاءاللہ۔۔۔کیا روپ چڑھا ہے''۔

''ہمارے بھائی صاحب تو خوش نصیب ہیں جنھیں تم جیسی خوبصورت اور ذہین لڑکی بطور ہمسفر ملی''۔

بارات آنے کا شور برپا ہوگیا، ہر کوئی حویلی کی بالکنی میں جھولتا ہوا نظر آنے لگا، بارات کو دُور سے ہی آتے دیکھا جاسکتا تھا، بڑی بڑی گاڑیاں جنھیں مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجایا گیا۔۔۔ پٹاخوں کا شور۔۔۔ ڈھول اور طاشوں کی آوازیں۔۔۔شہنائیوں کی گونج۔۔۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی۔۔۔روشنی۔۔۔اعلیٰ ولذیذ پکوان۔۔۔۔

اس شاندار ماحول کے ساتھ نکاح کی تقریب عمل میں آئی۔ اس حویلی کی لاڈلی نازوں سے پلی آج پرائی ہوگئی۔۔رُخصت ہوکر وہ اپنے حقیقی گھر پہنچی۔۔۔ وہ حویلی اس کی حویلی سے زیادہ بڑی اور شاندار تھی، یہاں ہر آسائش تھی۔۔۔سکون تھا۔۔۔رشتوں کا غلبہ تھا۔

وہ اپنا خوبصورت سراپا لیے حجلۂ عروسی میں پہنچی، لڑکیوں نے اسے بڑے ہی احتیاط سے پھولوں سے سجے بستر کے درمیان بٹھایا، وہ اپنی ہر ادا دکھاتی سب پر حاوی ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے کمرہ خالی ہوگیا، ہر طرف خاموشی چھا گئی، وہ انتہائی نزاکت سے اپنی ایک ایک چیز سنبھالے بیٹھی تھی کہ اچانک کمرے میں آہٹ سی محسوس ہوئی، اس کی دھڑکنیں بڑھ گئیں، وہ آہٹ اُسے اپنے قریب محسوس ہوئی، چند سیکنڈ تک وہ اسی طرح کھڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر الماری سے ایک فائل نکال کر اس پر اُچھال دی۔

اُس کی اس حرکت پر وہ بری طرح چونکی تھی، آج سے پہلے اُس کی اِس طرح بے عزتی کسی نے نہیں کی تھی۔ وہ خاموش رہی، مخالف سمت سے آواز آئی۔۔ایک بھاری آواز۔۔۔۔

''ان کاغذات پر دستخط کردو۔۔۔۔''

(3)

وہ اپنا دوپٹہ چہرے سے ہٹائی گمبھیر نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔۔ اس کی نظروں کو سمجھتے ہوئے وہ دوبارہ گویا ہوا۔

دوسال پہلے میں نے اپنی مرضی سے شادی کرلی جس کے سبب میرے والدین نے مجھے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی اور کہا۔۔ان کی مرضی کے مطابق شادی کرلوں تو وہ ایسا نہیں کریں گے۔۔۔ میں اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہوں۔۔۔تمھارا اور میرا ساتھ تب تک کا ہی ہے جب تک مجھے اپنی جائیداد نہیں مل جاتی۔۔۔ ان کاغذات پر لکھا ہے۔۔۔''جیسے ہی مجھے جائیداد سے حصّہ مل جائے گا میں تمھیں طلاق دے دوں گا، اور تمھیں اس بات سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

اس کا ایک ایک جملہ اس پر قہر بن کر برس رہا تھا۔ نازوں سے پلی کا مقدّر ایسا ہوگا کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا

تھا رونا کیا ہوتا ہے اِسے معلوم نہ تھا، جب بھی کسی شخص کو روتا دیکھتی تو سوچتی کہ یہ احساس انسان کے اندر پرورش کیسے پاتا ہے۔ آخر انسان روتا کیوں ہے؟۔۔اور آج اِسے اس چیز کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔۔۔وہ ہمیشہ اپنے خوبصورت اور ذہین ہونے پر رشک کرتی، پر اِسے کیا خبر صورتیں کتنی بھی حسین کیوں نہ ہوں نصیبوں کی محتاج ہوا کرتی ہیں۔۔۔

وہ نم آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اگر میں دستخط نہ کروں تو۔۔۔۔''

''۔۔۔تو میں تھیں تمھارے بھائیوں کے پاس چھوڑ آؤں گا۔''

جواب بغیر کسی تاخیر کے آیا۔

مجبوراً اس نے کانپتے ہوئے مہندی بھرے ہاتھوں سے ان کاغذات پر دستخط کردیے، وہ خوش شکل فائل اُٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے وہیں بیٹھی رہ گئی۔ ان پچیس سالوں میں کی جانے والی ہر تعریف ... دی جانے والی ہر دُعا... سرہانے والا ہر ہاتھ اِسے یاد آرہا تھا۔ آج تک اُسے جتنے بھی لوگوں نے خوش نصیب کہا تھا ان کے سامنے چیخ چیخ کر اپنا نصیب سنانے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ہر دنیاوی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا اور آج وہ سوچ رہی تھی اس شخص کے لیے...

مجبوراً اس نے کانپتے ہوئے مہندی بھرے ہاتھوں سے ان کاغذات پر دستخط کردیے، وہ خوش شکل فائل اُٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے وہیں بیٹھی رہ گئی۔ ان پچیس سالوں میں کی جانے والی ہر تعریف۔۔۔دی جانے والی ہر دُعا۔۔۔سرہانے والا ہر ہاتھ اِسے یاد آرہا تھا۔ آج تک اُسے جتنے بھی لوگوں نے خوش نصیب کہا تھا ان کے سامنے چیخ چیخ کر اپنا نصیب سنانے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ہر دنیاوی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا اور آج وہ سوچ رہی تھی اس شخص کے لیے۔۔۔۔

اُس کا ضبط ٹوٹا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ یہ احساس واقعی میں جان لیوا تھا۔ اس حویلی میں سب کچھ تھا۔۔ ہر چیز۔۔۔ ہر آسائش سکون۔۔۔بس وہی نہیں تھا جس کی ہر لڑکی کو چاہ ہوتی ہے۔۔۔۔وہ رشتہ جو اُسے اس پرائے گھر میں اپنا بناتا ہے۔۔۔اس کے پاس وہ ساتھ نہ تھا اس سے منسلک محبت و خلوص نہیں تھا۔ وہ شادی شدہ ہو کر بھی بیواؤں کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور رونق کہیں کھوگئی تھی، وقت نے نیا موڑ لیا تھا، اس کی زندگی ایک نقطے پر آکر تھم گئی تھی۔ اب چند ماضی کے مختصر لمحات ہی اس کے جینے کا سبب تھے۔

(4)

آج اُس کی شادی کو تین سال مکمل ہو گئے، اُس کے ہم سفر نے تیسری سالگرہ کے موقع پر اُسے طلاق کا تحفہ دیا تھا۔ وہ اِس کشمکش میں بیٹھی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ اِس کے ساتھ جو ہوا اُس میں اِس کا کیا قصور تھا، اُس نے کہیں پڑھا تھا، شکر گُزاری سیکھیں، جو چیزیں جو آسائشیں آپ کو فراہم ہیں ان کا شکر ادا کرتے رہیے۔ آپ کو جو چیزیں حاصل نہیں ان کے لیے کبھی جدو جہد نہیں کرنا پڑے گی۔ وہ خود بہ خود آپ کو حاصل ہوں گی۔ پر اُس کے مطابق وہ بات غلط ثابت ہوئی، اس نے اِن تین سالوں میں ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنے شریک حیات کو اپنی طرف راغب کر سکے۔۔۔ خود سے محبت کروا سکے۔۔۔ دُعائیں کی۔۔۔ وظیفے کیے۔۔۔ ہر وہ چیز ناکام رہی اور آخر میں وہی ہوا جس کا اُسے ڈر تھا۔

وہ گھٹنوں سے اپنا چہرہ نکالتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی، چار بج چکے تھے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اِس کی زندگی اب آنسوؤں سے بھر گئی تھی۔ جہاں کبھی مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں تھیں۔۔۔خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ ان کی جگہ اب آنسوؤں نے لے لی تھی اور اب چاہ کر بھی ان آنسوؤں کی جگہ وہ مسکراہٹیں نہیں آسکتی تھیں۔

زندگی بہت ظالم چیز ہے۔۔۔ یہی ہمیں ہنسنا سکھاتی ہے اور یہی رونا بھی سکھاتی ہے۔ جب یہ ہنساتی ہے تو لگتا ہے اس سے بہتر و اعلیٰ کچھ بھی نہیں۔ یہ ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے، ایک بھرم قائم کرتی ہے اور جب یہ غلط فہمی دُور ہوتی ہے تو بھرم ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔ اور جب یہ رُلاتی ہے تو ان آنسوؤں کا نعم البدل کچھ نہیں ہوتا۔

□□□

Unzela Moinuddin
65, Mahada Colony
Near Arqam Masjid
Malegaon (Nashik)-423203 (M.S)
Mobile No. : 9270161583

عرفانہ تزئین شبنم

سراب اور سمندر

وکٹر نے بے چینی کے عالم میں رسٹ واچ پر نظریں دوڑائیں، ماہی کو اب تک تو آجانا چاہیے تھا، اس نے خود کلامی کی، پہلی بار وہ اس کو موسیقی کی دھنوں پر تھرکتی نظر آئی تھی جب وہ بار میں بیٹھا سگار پی رہا تھا جیسے ہی وہ اس کے قریب گیا وہ جان کی بانہوں سے اچانک اس کی آغوش میں آگری تھی وکٹر بھی اس کی سیاہ آنکھوں میں ڈوب گیا تھا۔صرف چھ ماہ کے اندر بہت تیزی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے ویسے ماہی کے نزدیک یہ عرصہ بھی زیادہ ہی تھا۔

''ہائے..'' دور سے آتی ماہی نے ہاتھ ہلا کر اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ ڈالا۔

''کتنی دیر لگادی تم نے..؟''

''ہاں یار سوری اب چلو'' ماہی کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آگیا جب صبح صبح ممی پاپا کا زبردست جھگڑا ہوا تھا پاپا آفس جانے سے پہلے چائے مانگ رہے تھے اور ممی رات گئے کٹی پارٹی سے لوٹی تھیں تو نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی تھیں اور چائے دینے سے انکار کر دیا تھا پھر طیش بھری آوازیں...تکرار..اور تناؤ.....

اسی عالم میں وہ گھر سے نکلی تھی پھر وہ دونوں سنیما ہال پہنچ گئے یہ تو بس بہانہ تھا وہ ہر طرح کے ماحول کا حظ لینا چاہتے تھے دونوں ایک دوسرے کے پہلو سے چپکے بیٹھے تھے اندھیرے میں ڈوبا ہال اور ہیجان انگیز مناظر ان کے اندر تلاطم پیدا کر رہے تھے۔

•••

سرسبز لان میں بچھی لان چیرز پر بیٹھے ابا میاں اخبار دیکھ رہے تھے ان کے منہ سے ایک لمبی ''ہوں'' نکلی۔

''پتہ نہیں یہ لوگ ملک کو کس طرف لے جا رہے ہیں، تباہی ہے تباہی۔۔لوٹ مار، قتل و غارت گری، عورت کا استحصال اور غربت کا اندھیرا'' وہ تاسف سے بولے۔

''ہاں..اب تو زیادہ تر یہی اخبار کی سرخیاں ہوتی ہیں لیجیے چائے'' امی نے نرمی کے ساتھ ابا میاں کے ہاتھوں سے اخبار لے کر چائے تھمادی، یہ روز کا معمول تھا فجر کی نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد ابا میاں لان میں اتر آتے اخبار دیکھتے امی وہیں چائے لے جاتیں پورے گھر میں صبح کی چہل پہل شروع ہو جاتی زویا کالج کے آخری سال میں تھی ہر روز تیار ہونے کے بعد دادا جی کے کمرے میں ہلکا ناشتہ یا چائے کے ساتھ بسکٹ رکھنا زویا کی ذمہ داری تھی۔

خلاف معمول رات ابا میاں کے سینے میں ہلکا درد اٹھا امی زویا نصر اور یاسر پوری رات ابا میاں کے پاس بیٹھے رہے جو ہاسپٹل جانے کے لیے قطعی تیار نہ تھے پھر صبح سویرے ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور تشفی بخش جواب دیا گیس کا مسئلہ تھا پھر بھی پورا دن رشتہ دار دوست واحباب سے گھر بھرا رہا، دونوں ماموں اور چچا سویرے ہی آگئے تھے پھر خالہ پھوپھیاں اور ان کے بچے...خیر سے بھرا پرا خاندان تھا زویا کو سانس لینے کی فرصت نہ ملی امی ہنس ہنس کر پورا دن مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی رہیں رات کو جب زویا ابا میاں کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ کمرہ پھلوں خشک میوؤں اور انرجی بوسٹر پاؤڈر کے ڈبوں سے بھرا پڑا تھا جو پورا دن سب اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ابا میاں کی طبعیت تو سب کی محبت واپنائیت

سے ہی ٹھیک ہوگئی تھی وہ ہشاش بشاش اپنے بستر پر بیٹھے تھے۔

•••

''بات کیا ہے بجھی بجھی سی ہو'' وکٹر نے وہسکی کا پیک بناتے ہوئے ماہی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں.. بس ممی پاپا کی رنجشوں سے گھر کا ماحول آتش کدہ بن جاتا ہے وکٹر'' وہ اداسی سے بولی۔

''اس نے پیک آگے بڑھایا'' جسے وہ بلاتردد غٹا غٹ چڑھا گئی تا کہ اندر کا بوجھل پن کم ہو بہت دیر تک بار میں بیٹھے رہنے کے بعد وہ دونوں باہر نکلے تو ماہی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے وکٹر نے اسے بانہوں کا سہارا دیا اور گھر لے آیا۔ انجانے بوجھ سے جھکتی پلکوں کے ساتھ وہ وکٹر کے بیڈ پر ڈھے گئی۔

دن چڑھے وہ اٹھی تو سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔

''بیڈ ٹی'' وکٹر کی آواز پر وہ پلٹی۔

''نہیں ابھی میں چلوں گی'' کہتی وہ باہر نکل آئی گھر پہنچنے پر ممی نے تشویش کے ساتھ پوچھا

''ماہی...! کہاں تھیں رات بھر..؟''

''وہ مما اپنی دوست کے ساتھ'' اس نے نظریں چرالیں۔

''چلو کوئی بات نہیں فریش ہو جاؤ آج وگی آرہا ہے ائیر پورٹ جانا ہے اسے لینے'' وہ مطمئن انداز میں کہتیں آگے بڑھ گئیں۔

•••

کالج کا آخری فنکشن تھا واپسی میں زویا کو دو گھنٹے کی تاخیر ہوگئی جیسے ہی گھر پہونچی امی کی تشویش ناک آواز آئی۔

''اوہ زویا اتنی دیر لگا دی تم نے میری تو جان نکل گئی'' انھوں نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

''امی، آپ بھی نا.... آخری سال ہے سب بچھڑ جائیں گے پھر کہاں مل پائیں گے اس طرح'' وہ اداس ہوگئی۔

''دل چھوٹا نہ کرو آج کل ماحول کس قدر خراب ہے اس لیے ڈر گئی تھی تمھیں جس کی بھی یاد آئے اسے گھر بلا لینا یا پھر میں خود اس کے گھر لے چلوں گی'' انھوں نے چمکارا۔

گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے منگنی پچھلے سال ہی ہو چکی تھی۔ ابا میاں چاہتے تھے کہ سادگی کے ساتھ نکاح ہو جائے لیکن سب نے مل کر وہ اودھم مچایا کہ الاماں.... آٹھ دن پہلے سے پورا گھر برقی قمقموں سے سج گیا رشتہ دار اور دوست احباب نے خوب خوب ارمان نکالے پھر نکاح کے آٹھ دنوں بعد تک گھر روشنیوں سے جگمگاتا رہا پھر جلد ہی دونوں ہنی مون پر نکل گئے۔

•••

وقار کو اپنا نام بالکل بھی پسند نہیں تھا اس لیے اس نے خود کو وگی بنالیا وگی ہمہ وقت ماہی کے آگے پیچھے گھومتا رہتا دو ایک بار وہ اس کے ساتھ کیفے اور بار بھی جا چکا تھا وکٹر نے جس کا بالکل بھی برا نہیں مان۔ ادراصل وہ خود اس یکسانیت سے اکتا گیا تھا اور بدلاؤ چاہتا تھا بجھی بجھی سی ماہی میں اب کوئی چارم نہیں بچا تھا وہ خود الگ ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا ماہی اس کے بدلتے رویے سے حیران اور دکھی تھی۔ اسے وکٹر سے ایسی امید نہیں تھی اس نے تو دل سے چاہا تھا اور تا عمر ساتھ نبھانے کے خواب دیکھے تھے لیکن وقت کے ساتھ وکٹر اس سے دور ہوتا چلا گیا جیسے

کوئی سراب....

کوئی چھلاوہ...

مغرب کی دلدادہ ماہی کی ماں جب اپنا وطن چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یہاں آئی تو نہیں جانتی تھی کہ یہاں کا بیمار معاشرہ اس کی زندگی پر تیرگی کی چادر تان دے گا رشتے کسی ٹوٹی مالا کے موتیوں کی طرح بکھر جائیں گے اس نے تو اپنے ساتھ اپنی بیٹی کی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی۔

•••

زویا کی نئی زندگی بہت خوبصورت تھی ساس سسر میں اسے امی اور ابا میاں نظر آتے اور جن لوگوں نے اتنے پیارے شہزاد کو جنم دیا ایک اچھا اور پیارا انسان بنا کر اس کے حوالے کیا تھا ان پر سے تو پوری دنیا وار دینے کا من کرتا زندگی بہت مصروف ہوگئی تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب شہزاد میٹرنٹی ہوم کے باہر بے چین و ہراساں ٹہل رہا تھا تبھی ایک ننھی کلکاری گونجی دروازہ کھلتے ہی وہ لپک کر اندر چلا گیا اور نڈھال نڈھال سی زویا کی پیشانی چوم لی اور اس کا ہاتھ تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ زویا نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں دائیں جانب کپڑے میں لپٹی مخملیں سی پری کو دیکھا اور اپنے کمزور ہاتھوں کو شہزاد کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں دیکھ کر طمانیت و تحفظ کی ایک گہری لہر من کے اندر سے اٹھی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔

□□□

Irfana Tazeen Shabnam
967, K Adam Saheb Street
Muslimpur
Vaniyambadi-635751 (Tamil Nadu)

لذیذ پکوان

چاول کے آٹے کے بغیر کرسپی جوار اور باجرے کی فوری ترکیب

جوار ڈوسا کے لیے

جوار کا آٹا آدھا کپ، گندم کا آٹا ایک چوتھائی کپ، دہی ایک چوتھائی کپ، نمک آدھا چائے کا چمچ، ادرک ہری مرچ کا پیسٹ ایک چوتھائی چائے کا چمچ، بیکنگ سوڈا-1 چٹکی

باجرے کے ڈوسہ کے لیے

باجرے کا آٹا آدھا کپ، بیسن ایک چوتھائی کپ، دہی ایک چوتھائی کپ، نمک آدھا چائے کا چمچ، اجوائن آدھا چائے کا چمچ، بیکنگ سوڈا ایک چٹکی

ٹماٹر مونگ پھلی کی چٹنی کے لیے

تیل 1 چمچ، میتھی کے بیج چائے کا چمچ، زیرہ 1 چمچ، ہینگ 1 چٹکی، ہلدی چائے کا چمچ، ٹماٹر 2، کٹا، ادرک 1 انچ، لال مرچ 2، ہری مرچ 2، دھنیا پاؤڈر 1 چمچ، نمک 1 چمچ، مونگ پھلی آدھا کپ، بھنی ہوئی

آلو مسالہ کے لیے

تیل-1 چمچ، زیرہ-چائے کا چمچ، ہینگ-1 چٹکی، دھنیا پاؤڈر-1 چمچ، ادرک ہری مرچ کا پیسٹ-1 چائے کا چمچ، ہلدی-چائے کا چمچ، ٹماٹر -2، باریک کٹا، نمک-نمک-1 چمچ سے تھوڑا کم، ابلے ہوئے آلو-5، درمیانے، لال مرچ-چائے کا چمچ، دھنیا کے پتے-2-3 کھانے کے چمچ

چٹنی بنانے کا عمل

ایک پین میں 1 چمچ تیل ڈال کر گرم کریں۔ گرم تیل میں میتھی کے بیج اور 1 عدد زیرہ ڈال کر ہلکا سا بھونیں۔ آگ کو دھیما کریں اور اس میں 1 چٹکی ہینگ، ہلدی پاؤڈر، 2 بڑے کٹے ہوئے ٹماٹر، 1 انچ ادرک، 2 ہری مرچ، 2 سرخ مرچ، 1 عدد دھنیا پاؤڈر اور 1 چائے کا چمچ نمک شامل کریں۔ سب کو اچھی طرح مکس کریں اور 2-3 کھانے کے چمچ پانی ڈالیں، پھر ٹماٹروں کو ڈھک کر ہلکی آنچ پر 5 منٹ تک پکائیں۔

وقت ختم ہونے کے بعد، انھیں باہر نکالیں اور ٹھنڈا کریں۔ جب یہ ٹھنڈا ہو جائے تو ایک مکسر جار میں بھنے ہوئے مسالہ ٹماٹر، کپ بھنی ہوئی مونگ پھلی اور 3-4 کھانے کے چمچ پانی ڈالیں۔ ان کو پیس لیں، پیسنے کے

بعد چٹنی تیار ہوجائے گی۔

تڑکا پین میں 1 چمچ تیل گرم کریں۔ گرم تیل میں ایک چائے کا چمچ سرسوں کے بیج ڈال کر کڑکنے دیں۔ جب یہ کڑک جائے تو اس میں 8-10 کری پتے اور 2 پوری لال مرچیں ڈال کر ہلکا سا بھونیں اور چٹنی پر ڈال دیں۔ ٹمپرنگ چٹنی تیار ہوجائے گی۔

آلو مسالہ بنانے کا عمل

ایک پین میں 1 چمچ تیل ڈال کر گرم کریں۔ آگ کو دھیما کریں، اس میں ایک عدد زیرہ، 1 چٹکی ہینگ، 1 عدد دھنیا پاؤڈر، 1 عدد ادرک ہری مرچ کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ ہلدی پاؤڈر ڈال کر گرم تیل میں ہلکا ہلکا

فرائی کریں۔ پھر دو باریک کٹے ہوئے ٹماٹر، 1 چائے کے چمچ سے تھوڑا کم نمک یا حسب ذائقہ اور 2-3 کھانے کے چمچ پانی ڈالیں۔ انہیں مکس کریں، ڈھانپیں اور درمیانی آنچ پر 3 منٹ تک پکائیں

اگر وقت ختم ہونے کے بعد پانی رہ جائے تو اسے 2 منٹ تک کھلا پکائیں۔ جب پک جائے تو 5 اُبلے ہوئے آلو، ایک عدد سرخ مرچ اور تھوڑا سا ہرا دھنیا ملا دیں۔ انہیں فرائی کرتے ہوئے 1-2 منٹ تک پکائیں، مسالہ آلو تیار ہوجائیں گے، نکال لیں۔

جوار ڈوسا کے لیے بیٹر بنانے کا عمل

ایک پیالے میں کپ جوار کا آٹا، کپ گندم کا آٹا اور کپ دہی ڈال کر مکس کریں۔ پھر تھوڑا تھوڑا پانی ڈالیں اور اس وقت تک پھینٹیں جب تک گانٹھ ختم نہ ہوجائے۔ پھر تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر بیٹر کو نہ زیادہ گاڑھا نہ زیادہ پتلا بنا کر تیار کریں۔ جب بیٹر تیار ہوجائے تو ایک عدد نمک اور ایک چائے کا چمچ ادرک ہری مرچ کا پیسٹ ڈالیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور اسے 15 منٹ تک ڈھانپ کر رکھیں۔

جوار کا ڈوسا بنانے کا عمل

بیٹر میں 1 چٹکی بیکنگ سوڈا ڈالیں اور اسے 1-2 منٹ تک پھینٹیں۔ پین کو گرم کریں اور اس پر تیل ڈال کر پھیلا دیں، پھر پین پر پانی ڈال کر ٹھنڈا کریں۔ آگ کو دھیما کریں اور پین پر ڈال کر آٹے کو پھیلائیں، پھر شعلے کو درمیانی اونچی کریں، چاروں طرف تیل ڈالیں اور ڈوسہ کو پکنے دیں۔ جب ڈوسا نیچے سے پک جائے اور اس پر بھورے دھبے نظر آئیں تو اسے فولڈ کر کے نکال لیں۔

تمام ڈوسوں کو اسی طرح بنالیں، اگر آپ چاہیں تو آلو کے مسالے کو درمیان میں فولڈ کر کے مسالہ ڈوسا بنالیں۔ یاد رکھیں کہ ہر خوراک کو پھیلانے سے پہلے آٹے کو اچھی طرح ہلانا ضروری ہے۔ جوار کا ڈوسا تیار ہوجائے گا۔

باجرے کے دوسا کے لیے بیٹر بنانے کا عمل

ایک پیالے میں جوار کا آٹا، کپ چنے کا آٹا اور کپ دہی مکس کریں۔ تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر ایسا محلول بنائیں جو نہ زیادہ گاڑھا ہو اور نہ زیادہ پتلا۔ اسے 1-2 منٹ تک اچھی طرح ہلائیں، پھر چائے کا چمچ نمک اور کیرم کے بیج (ہتھیلی پر کچل کر) ڈالیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور اسے 15 منٹ تک ڈھانپ کر رکھیں۔

باجرے کا ڈوسا بنانے کا عمل

اس میں 1 چٹکی بیکنگ سوڈا ڈالیں اور اسے 1-2 منٹ تک ماریں۔ پین کو گرم کریں اور اس پر تیل ڈال کر پھیلا دیں، پھر پین پر پانی ڈال کر ٹھنڈا کریں۔ آگ کو دھیما کریں اور پین پر ڈال کر آٹے کو پھیلا دیں، پھر شعلے کو درمیانی اونچی کریں، چاروں طرف تیل ڈال کر ڈوسہ کو پکنے دیں۔ جب ڈوسا نیچے سے پک جائے اور اوپر بھورے دھبے نظر آئیں تو اسے فولڈ کر کے نکال لیں۔

تمام ڈوسہ اسی طرح بنالیں، تھوڑا سا آلو مسالہ بھی درمیان میں رکھ کر فولڈ کرلیں۔ ہر ڈوسا پھیلانے سے پہلے آٹے کو اچھی طرح ہلانا ہوگا، اس طرح باجرے کا ڈوسا تیار ہوجائے گا۔

(بحوالہ: www.nishamadhulika.com)

□□□

ورزش اور صحت

ڈاکٹر محمد افروز عالم

تعارف:

فی زمانہ ورزش کرنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے فوائد بھی گنوائے جاتے ہیں۔ ورزش کسی بھی ایسی حرکت کو کہتے ہیں جس سے انسانی جسم میں موجود اضافی کیلوری کو جلانے میں مدد مل سکے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ درحقیقت ورزش ایک انمول اور قیمتی معمول ہے جو کوئی بھی انسان اپنا سکتا ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کل کے دور میں تحقیقات کے انبار کے باوجود کسی بھی طریقہ علاج، تدبیر اور ٹوٹکے کے حقیقی پہلو اس طرح اجاگر نہیں کیے جاتے جو اس کا حق ہوتا ہے۔ ہماری سائنسی تحقیق بھی بھیڑ چال کا شکار نظر آتی ہے۔ ہماری تحقیقات میں بھی وہیں رویہ کارفرما نظر آتا ہے جو ہم روزمرہ زندگی میں دیگر عام چیزوں کے بارے میں رکھتے ہیں۔یعنی کسی چیز کا کوئی چھوٹا سا فائدہ نظر آجائے، چاہے وہ اپنے اندر کتنے ہی ضمنی بداثرات کیوں نہ لیے ہو، ہم اسے فوراً آسمان پر پہنچادیتے ہیں، اور کوئی چیز کتنی مفید کیوں نہ ہو، اس کا معمولی نقصان نظر آنے پر ہم اسے زمین پر دے مارتے ہیں۔

اب ورزش کو ہی لے لیجیے۔مختلف مواقع پر ورزش کے مثبت نتائج دیکھ کر ہم عموماً ہر شخص کے لیے ورزش کو یکساں مفید تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بہت ہی غیر سائنسی اور لغو خیال ہے، کیونکہ ورزش بذات خود بعض مواقع پر، مخصوص حالات اور اثرات کی وجہ سے فائدے کے بجائے نقصان کا سبب ہوتی ہے۔ زیر نظر مضمون میں یہی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ورزش کن حالات میں مفید ہے اور کب نقصان کا باعث ہوسکتی ہے۔اور یہ کہ ہم ورزش سے کیسے کماحقہ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

ورزش:

زمانہ قدیم کے طبیبوں اور حکیموں نے ورزش یا ریاضت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ان میں بوعلی سینا کو نمایاں مقام حاصل ہے۔انھوں نے ورزش یا ریاضت کے جو فوائد، اصول اور قوانین بیان کیے ہیں وہ اپنی جگہ ایک سچ ہے۔اگر فی زمانہ ان اصول وضوابط پر عمل کرکے ورزش کو اپنایا جائے تو صرف ورزش ہی سے انسان اپنی صحت کے 80 فیصد مسائل حل کرسکتا ہے، کیونکہ ورزش ایک ایسا جامع عمل ہے کہ جسے اگر اس کی مکمل شرائط اور پابندیوں کے ساتھ ادا کیا جائے تو جسم سے ان تمام امراض کا، جن کا تعلق کسی مادّے یا فضلے سے ہوتا ہے، قلعہ قمع کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان کی دیگر تدابیر اور چھ ضروری اسباب زندگی نارمل انداز میں ہوں۔ مثلاً اس کی غذا مناسب اور متوازن ہو۔اس کا سونا اور جاگنا باقاعدہ اور متوازن ہو۔نفسیاتی اور روحانی حالت مضبوط اور بہترین ہو۔اس کی رہائش آلودہ مقام پر نہ ہو۔جسم سے فضلات کا اخراج نارمل انداز سے ہو یعنی پاخانہ، پیشاب اور پسینہ وغیرہ نارمل انداز سے آئیں۔

اگر مندرجہ بالا اسباب زندگی معمول پر ہوں تو کوئی دوا، گولی، ٹانک وغیرہ ورزش کا نعم البدل نہیں ہوسکتے۔لیکن اگر مذکورہ اسباب زندگی نارمل نہ ہوں اور ورزش کو اس کی شرائط کے ساتھ نہ کیا جائے تو پھر فائدہ

حاصل ہونا محال ہے۔

ورزش کی شرائط:

1. ورزش کی مقدار
2. اوقات ورزش
3. ورزش سے پہلے کی غذا
4. ورزش کرنے والے کی عمر
5. ورزش کرنے والے کا جسمانی مزاج
6. ورزش کرنے والے کی جسمانی حالت وقوت
7. جس زمانے یا وقت میں ورزش کی جارہی ہے اس کی نوعیت
8. اگر جسم میں کوئی عضو بیمار یا کمزور ہے تو اس کی حالت

اگر ان تمام شرائط کی باریکیوں کو مدِنظر رکھ کر ورزش کی جائے تو ورزش بذات خود ایک مکمل طریقہ علاج بن جاتا ہے۔

1. ورزش کی مقدار:

پہلی شرط کے مطابق ہر ایک انسان کے لیے ورزش کی مقدار مختلف ہے، کیونکہ ہر شخص کی قوت اور اس کے اعضاء یکساں ریاضت اور ورزش کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس کے علاوہ ورزش کے دوران بعض علامات ایسی ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ میں ورزش کہاں پر ختم کردوں۔ مثلاً جب حرکات ورزش سے جسم یا وہ عضو جس کی ورزش کی جارہی ہے، اس میں سرخی پیدا ہوتی چلی جائے اور بتدریج بڑھتی رہے، اس عضو یا جسم میں نکھار آئے، جسم یا عضو کی ورزشی حرکات با سہولت ادا ہوتی رہیں، جسم یا عضلات جب تک پھولتے جائیں، خصوصاً ان کی وریدیں پھولتی جائیں، تو سمجھنا چاہیے کہ ابھی ورزش کرنی چاہیے۔ لیکن، اگر اس کے برعکس، جسم یا عضلات کا رنگ زرد ہونا یا ان میں نکھار کم ہونا شروع ہوجائے، ورزش کی حرکات ادا کرنا مشکل اور دوبھر ہوجائے، اعضاء کے عضلات اور وریدیں پھولنا بند ہوجائیں تو ورزش ختم کردینی چاہیے۔ ان علامات کے بعد بھی ورزش کرنا اور جسم پر اضافی بوجھ ڈالنا بہت خطرناک ہوتا ہے، جو فائدے کے بجائے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور دیگر افراد ورزش کے لیے جیم یا باڈی بلڈنگ کلب میں داخلہ لے لیتے ہیں، اور وہاں مختلف اقسام اور وزن کے ڈمبل، باربیل وغیرہ کے ساتھ ورزش کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ایسا کرنا بالکل مفید نہیں بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ اس کے پہلے اپنی جسمانی حالت کو پرکھیے اور پھر اس کے لیے کسی ماہر سے مشورہ کے بعد ورزش کا منصوبہ اور اس کی مقدار ترتیب دیجیے۔ بصورت دیگر ہر کوئی اگر بھاری اوزان اور ڈمبل وغیرہ سے ورزش کرنا شروع کردے تو بعض مرتبہ مقدار سے زیادہ ورزش کرنے کی وجہ سے الٹا نقصان ہوسکتا ہے۔

2. اوقات ورزش:

جہاں تک ورزش یا ریاضت کے وقت کی بات ہے، تو یہ عموماً یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ورزش کے وقت معدہ خالی ہونا چاہیے، جو بہت ہی لغو بات ہے، اور خطرے سے بالکل خالی نہیں۔ ورزش کے وقت معدہ یکسر خالی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں تھوڑی بہت غذا ضروری موجود ہونی چاہیے۔ اسی لیے جب آپ گرمیوں میں ورزش کرتے ہیں تو اس کے لیے صبح سویرے کا وقت مناسب ہوتا ہے کیونکہ باقی تمام دن میں حرارت زیادہ ہوتی ہے اور صبح کے علاوہ ورزش کرنے سے عضلات طاقتور ہونے کے بجائے کمزور ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے گرمیوں میں علی الصبح ورزش کرنے سے پہلے کچھ کھاپی لینا چاہیے۔ بعض ماہرین پانچ گرام شہد اور چند بادام کھالینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ بعض ماہرین گرمیوں میں صبح ورزش سے پہلے دودھ اور شربت کا ایک چمچہ پی لینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

موسم ربیع یعنی اکتوبر سے لے کر مارچ تک ورزش سہ پہر کو کی جانی

چاہیے۔ اوراس وقت اگر کچھ کھائے پیئے بغیر ہی ورزش کر لی جائے تو زیادہ مناسب و مفید ہے کیونکہ غذا کا کچھ حصہ معدے میں موجود ہوتا ہے۔ سردیوں میں ورزش شام کو کرنی چاہیے اور ورزش کسی گرم اور معتدل کمرے میں کی جائے۔

3. ورزش سے پہلے کی غذا:

ورزش سے پہلے جو مقوی غذا ماہرین نے تجویز کی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ورزش کے دوران انسان کو وہ مطلوبہ توانائی حاصل ہوتی رہے جو ورزش کے بہترین نتائج سامنے لا سکے۔ کیونکہ خالی معدہ اور بھرے ہوئے پیٹ، دونوں صورتوں میں ورزش نقصاندہ ہوتی ہے۔ اسی لیے ماہرین نے ورزش سے پہلے شہد، بادام، کھجور وغیرہ کھانے کی ہدایت کی ہے ،تاکہ نہ صرف ورزش کے دوران انسان کو مطلوبہ توانائی حاصل ہو سکے بلکہ خالی معدہ ورزش کرنے کے وبال سے بھی محفوظ رہا جا سکے۔

4. ورزش کرنے والے کی عمر:

یہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ جو شخص ورزش کر رہا ہے اس کی عمر کیا ہے؟ نوجوان، صحت مند اور مضبوط اعصاب و عضلات والے افراد سخت ورزش سے فائدہ پاتے ہیں اور ورزش انہیں روز بروز مزید قوت اور توانائی عطا کرتی ہے۔ ان کی بنسبت کمزور افراد سخت ورزش سے مزید کمزور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہلکی پھلکی ورزش مفید ہوتی ہے۔ بوڑھے اور زیادہ عمر والے لوگوں کو وزن مثلاً ڈمبل، باربیل اور راڈ وغیرہ کے ساتھ سخت ورزش نہیں کرنا چاہیے بلکہ جسمانی لچک اور عضلات کو توانائی بہم پہنچانے والی حرکات اور مختلف آسن سے اپنے جسم کو ریاضت دیں۔ اس کے لیے بیٹھکیں لگانا، ڈنڈ پیلنا اور برج بنانا وغیرہ جیسی ورزش اور تیز چلنا بہت مفید ہیں۔ درمیانی عمر والے افراد اپنے جسمانی قوت کے لحاظ سے ورزش کی منصوبہ بندی کریں۔ اگر وہ مضبوط ہوں تو وزن والی ورزش کر سکتے ہیں۔ اور اگر مضبوط نہ ہوں تو بتدریج ہلکی ورزش سے سخت ورزش کی طرف جائیں۔

5. ورزش کرنے والے کا جسمانی مزاج:

انسان کے جسمانی مزاج کا ورزش سے مطابقت رکھنا بھی ضروری ہے۔ ایسے لوگ جن کے جسم پر خشکی اور سوداویت کا غلبہ ہو، اگر وہ سخت ورزش سے شروع کر دیں تو یہ ان کے جسم میں اور عضلات میں مزید خشکی پیدا کر دے گی۔ اس لیے ایسے افراد کو چاہیے کہ پہلے ہلکی پھلکی ورزش کریں اور ساتھ میں انگور، آم، تربوز، کیلا، خربوزہ جیسے پھلوں کا استعمال بھی کریں۔ اور جب ان غذاؤں اور تدابیر سے جسم میں رطوبت بڑھ جائے تو پھر آہستہ آہستہ وزن کی ورزش کی طرف جائیں۔ ان کی بنسبت ایسے افراد جو بہت موٹے، فربہ اور لحیم شحیم ہوں اور ان کے جسم میں رطوبت اور تری کی کثرت اور ان کا مزاج بلغمی ہو، وہ شروع سے سخت ورزش کریں اور بتدریج روزش کا وزن بڑھاتے جائیں جب کہ خشک اور مقوی غذائیں استعمال کریں مثلاً خشک میوہ جات، شہد، بھنے ہوئے چنے، بھنا ہوا گوشت، مچھلی وغیرہ۔

6. ورزش کرنے والوں کی جسمانی حالت وقوت:

ورزش صرف اور صرف اسی وقت کی جائے جب آپ کی جسمانی حالت اور قوت اس قابل ہو کہ آپ ورزش کر سکیں۔ اگر آپ کی جسمانی حالت اور قوت اس قابل نہیں، یعنی آپ بیماری سے اٹھے ہیں یا کوئی شدید مرض لاحق ہے، تو ان صورتوں میں ورزش بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

7. جس زمانے یا وقت میں ورزش کی جا رہی ہے اس کی نوعیت:

ہر ورزش کرنے والے کو چاہیے کہ وقت، حالات اور موسم کے مطابق ورزش کی منصوبہ بندی کریں۔ مثلاً گرمیوں میں ہر ورزش کرنے والا شخص، سردیوں کی بنسبت کم مقدار، کم وقت اور کم وزن کی ورزش کریں۔ اسی طرح ہندوستان اور دیگر ممالک کے حالات اور آب و ہوا کے تغیر کی وجہ سے، اپنے اپنے علاقے کی آب و ہوا، موسم اور حالات کے لحاظ سے ورزش کا انتخاب کریں۔ مثلاً میدانی علاقوں کے لوگوں میں اکثر کا مزاج خشک ،کمزور اور نحیف ہوتا ہے، جب کہ وہاں کی آب و ہوا بھی گرم و خشک ہوتی ہے، لہٰذا ایسے افراد اپنے موسم اور جسمانی حالات کے پیش نظر پہاڑی علاقے کی بنسبت مقدار و وزن کے حساب سے کم ورزش کا انتخاب کریں۔ خصوصاً گرمیوں میں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

8. اگر جسم میں کوئی عضو بیمار یا کمزور ہے تو اس کی حالت:

انسان کے جسمانی اعضاء کی حالت بھی ورزش کے پروگرام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا کوئی عضو کمزور یا ماؤف ہو، تو اس عضو کی ورزش کرتے وقت خاص احتیاط برتنا ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دل کے عارضے میں مبتلا ہو تو ایسے شخص کو بھی سخت ورزش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی پاؤں یا کوئی ہڈی کسی حادثے کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ انہیں چاہیے کہ ان اعضاء پر ورزش کے دوران کم بوجھ ڈالیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض افراد کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ ورزش کے دوران خاص احتیاط کریں اور ایسے اعضاء کی ورزش کریں جن سے ان مہروں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے مگر دیگر اعضاء کی ریاضت کا اثر ان پر معمولی نوعیت کا پڑتا رہے تاکہ یہ بھی اس کے زیر اثر مضبوط ہوتے رہیں۔

مندرجہ بالا آٹھ شرائط کے علاوہ بھی کچھ باتیں ایسی ہیں جو ورزش سے پہلے یا بعد میں اختیار کرکے انسان ورزش کے فوائد سے مکمل طور پر مستفید ہوسکتا ہے۔ مثلاً ورزش شروع کرنے سے پہلے پیشاب اور پاخانے سے فراغت ضروری ہے کیونکہ اس سے آنتوں اور مثانے پر تناؤ کم ہوجاتا ہے اور انسان ورزش سے مکمل طور پر مستفید ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ورزش شروع کرنے سے پہلے بدن پر کسی مرطوب روغن مثلاً روغن سرسوں، روغن ناریل، روغن بادام وغیرہ کی مالش کرسکتے ہیں۔ اس سے بدن میں ورزش کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت ورزش کے لیے بیدار ہوجاتی ہے۔

صحت کے لیے ورزش کی اہمیت:

صحت اور تندرستی انسان کی لازمی ضرورت ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کے لیے جسمانی اور ذہنی صحت کا اچھا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لیے صحت کی حفاظت کے لیے ورزش کے لیے وقت کی تنظیم کرنا ضروری ہے۔ صحت کی حفاظت کے لیے اوقات کو منظم کرنے کی ضرورت اور اہمیت کو بھی سمجھنا ہوگا۔ کیونکہ حفظانِ صحت کوئی جزوقتی کام نہیں ہے بلکہ ہمہ وقت اس کے لیے فکرمند اور حساس رہنا ضروری ہے۔ صحت ایک عظیم نعمت ہے اور افراد اپنے معمولات میں ضروری ترمیم اور منصوبہ بندی کرکے اس نعمت کی حفاظت کرسکتے ہیں۔ پیدل چلنے کی عادت ڈالیں جیسے اوپر یا نیچے کی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیوں کا زیادہ استعمال کریں۔ لفٹ کا استعمال کم کریں۔ سائیکل کچھ دیر ضرور چلائیں۔ متوازن طرز زندگی جس میں تمام ضروری کاموں کے لیے ان کے تناسب کے اعتبار سے وقت ہو اور ان کاموں کو انہی اوقات میں انجام دیا جائے جو اس کے لیے مقرر ہیں۔ بہترین صحت کی ضمانت ہے۔ متوازن غذا اور ورزش سے صحت برقرار رہتی ہے، بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں بھی معاون ہوتے ہیں۔ ورزش کے ذریعے انسان کے جسم کی صحیح نشوونما ہوتی ہے، اس کے اعصاب مضبوط ہوتے ہیں، ہاضمہ درست رہتا ہے اور انسان کی قوت مدافعت یعنی بیماریوں سے مقابلہ کرنے کی جسم کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیند بھی اچھی آتی ہے اور توجہ بہتر ہوتی ہے۔

خلاصہ:

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق دنیا کی ایک تہائی آبادی ضرورت کے مطابق جسمانی ورزش نہیں کرتے ہیں۔ جسمانی ورزش نہیں کرنے کی وجہ سے لوگوں کو امراض قلب، ذیابطیس اور مختلف نوعیت کے سرطان لاحق ہونے کا خطرہ ہے۔ آج کل مرد و خواتین کو مٹاپے، دل کی بیماریوں اور ذیابطیس سے بچنا بہت ضروری ہے۔ جسمانی ورزش سے خلیہ اور ٹشوز کی تعمیر و مرمت ہوتی ہے۔ جسم میں ایسے ہارمون خارج ہونے لگتے ہیں جو ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ جسم میں آکسیجن جذب کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

بقول شاعر

دوا کوئی ورزش سے بہتر نہیں
یہ نسخہ ہے کم خرچ بالا نشیں
ہر ایک دانشور کہتاہے بات یہی
ورزش ایک ضرورت ہے انسان کی

جدید دور کے طرز زندگی نے مرد و خواتین کی صحت پر بہت مضر اثرات ڈالے ہیں۔ بہت سے وہ کام جو انسان یومیہ کرلیتا تھا اور اس کی ورزش کی بنیادی ضرورت پوری ہوجاتی تھی وہ بھی چھوٹ گئے ہیں۔ اس لیے صحت کی بقاء اور اس کے تحفظ کے لیے ورزش ضروری ہے کیونکہ متوازن اور یومیہ ورزش مرد و خواتین کے لیے بہتر صحت کی ضمانت ہے۔

حوالے:

1. عالمی ادارہ صحت (WHO) https://www.who.int
2. محمد نسیم اختر (2012)، جہان سائنس، دہلی
3. کے۔آر۔راؤ (2020)، لائف اسکلس ایجوکیشن، حیدرآباد
4. بی۔این۔داس (2019)، ہیلتھ اینڈ فزیکل ایجوکیشن، نئی دہلی
5. الطاف حسین (2020)، ساؤنڈ ہیلتھ مینجمنٹ، نئی دہلی
6. آر۔گوپال (2018)، ہیلتھ ایجوکیشن، حیدرآباد
7. اقوام متحدہ فنڈ برائے آبادی (UNFPA)
https://www.unfpa.org

□□□

Dr. Md. Afroz Alam
Assistant Professor
Maulana Azad National Urdu University
Collge of Teacher Education
Chandanpatti, Laheriasarai
Darbhanga - 846002 (Bihar)
Mobile: +918885472844
Email: afrozmanuu@gmail.com;
afroz@manuu.edu.in

حسن کی نگہداشت

منہ دھونے کے بعد یہ چیز چہرے پر لگائیں دھوپ میں بھی آپ کا رنگ گورا اور چمک دار نظر آئے گا

موسم گرما میں خاص طور پر جون، جولائی اور اگست میں جب سورج سوا نیزے پر آجاتا ہے اور دُھوپ رنگ کو جلا کر کالا کر دیتی ہے اور پسینے اور حُبس سے چہرہ پیلا اور بدرنگ ہوجاتا ہے اور جیب اجازت نہیں دیتی کے مہنگے فیس واش خرید سکیں ایسے دگرگوں حالات میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو چہرے کا رنگ دودھ جیسا صاف اور شفاف کرنے کے لیے 3 انتہائی سستے اور آسان گھریلو ٹوٹکے بتائیں گے۔ جن کے استعمال سے آپ کے چہرے کی رونق واپس لوٹ آئے گی اور آپ کے حُسن کے چرچے دُور دُور تک پھیل جائیں گے۔ اگر آپ کا رنگ دھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے کالا ہوگیا ہے تو پریشان نہ ہوں صرف 2 کھانے کے چمچ دہی میں ایک لیموں کا رس شامل کریں اور اس آمیزے کو صبح شام چہرے پر اچھی طرح ملیں اور کچھ دیر لگا رہنے دیں اور پھر ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں آپ کا چہرہ پھولوں جیسا تروتازہ ہو

جائے گا۔ دھوپ کی شدت سے اگر رنگ بہت زیادہ جل گیا ہو تو بھی پریشان نہ ہو اور صرف ایک چمچ جو کے آٹے میں دو چمچ دہی شامل کر کے آمیزہ بنالیں پھر اس آمیزے میں صرف ایک چمچ کھیرے کا رس نچوڑ کر شامل کریں اور اس آمیزے کو چہرے اور ہاتھوں پر اچھی طرح ملیں اور 30 منٹ تک لگا رہنے دیں 30 منٹ کے بعد منہ ہاتھ صابن سے دھولیں آپ کا چہرہ ایسے چمکنے لگے گا جیسے کسی مہنگے پارلر سے فیشل کروایا ہو۔ چہرے کی جلد کو ملائم اور چمکدار بنانے کے لیے ہم وزن مکئی اور جو کے آٹے کو گرم پانی میں بھگودیں اور کچھ دیر بھیگا رہنے دیں پھر ہاتھ سے مل کر ملائم کر لیں اور اس آمیزے میں آدھے لیموں کا رس شامل کر کے چہرے اور گردن پر مل لیں اور خشک ہونے پر ہاتھوں سے آہستہ آہستہ مل کر امیزے کو اُتار دیں اور نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو دیں یہ آپ کا رنگ صاف کر دے گا اور جلد کو نرم اور ملائم بنادے گا۔

چہرے کی خوبصورتی کے لیے 8 جادوئی گھریلو ٹوٹکے جس سے چہرہ چاند کی طرح چمکے گا

ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے چہرے کی جلد تمام مسائل سے پاک اور چمکتی دمکتی نظر آئے۔ ان مسائل سے مہنگے مہنگے علاج یا کریمیں استعمال کئے بغیر بھی نمٹا جاسکتا ہے اس کے لیے آپ کے گھر کا کچن آپ کا سب سے بڑا معاون ثابت ہوگا۔ چہرے کی چمک کے لیے

بیکنگ سوڈا کا استعمال بیکنگ سوڈا کو لیموں کے رس میں ملا کر پیسٹ بنالیں اور اس پیسٹ میں چند قطرے ناریل کا تیل ملا لیں انہیں اچھے طریقے سے مکس کریں اور اس پیسٹ کو اپنے چہرے پر لگالیں۔ سوکھ جانے پر اپنے چہرے کو اچھی طرح دھولیں اس پیسٹ کے استعمال سے آپ کی جلد چمک اٹھتی ہے۔ دانوں اور کیل مہاسوں سے نجات کے لیے شہد کا استعمال: چہرے پر نکلنے والے دانوں اور کیل مہاسوں سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو رات کو سونے سے پہلے انگلی کی مدد سے متاثرہ حصے پر شہد لگالیں اور پرسنی پلاسٹ یا کوئی بینڈ ایج لگالیں۔ صبح اٹھ کر واضح فرق محسوس کریں گے۔ کھیرے کی مدد سے بلیک ہیڈز سے نجات۔ اس سے تقریباً ہر کوئی پریشان رہتا ہے کھیرے کو کدوکش کر کے اسے اپنے چہرے آنکھوں اور گردن پر پندرہ منٹ کے لیے لیپ کر دیں اور پھر دھو لیجئے دانوں اور بلیک ہیڈز سے نجات کے لیے بہت ہی آزمودہ نسخہ ہے اس کے علاوہ بلیک ہیڈز کے خاتمے کے لیے ایک اور آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ ٹماٹر کا پیسٹ شہد مکس کر کے ماسک کے طور پر اپنے چہرے پر لگائیں۔

لیموں میں چھپے خوبصورتی کے کئی راز۔۔ جانیں لیموں سے خوبصورتی، فٹنس اور وزن کم کرنے کا طریقہ

لیموں قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک انمول تحفہ ہے، کیونکہ اس ایک لیموں میں اتنے فوائد چھپے ہیں کہ یہ ہمارے کئی مسائل کا واحد حل ہے۔ آج ہم آپ کو بتانے جا رہے ہیں لیموں سے خوبصورتی بڑھانے، فٹنس برقرار رکھنے اور وزن کم کرنے کے طریقے جنہیں آزما کر آپ بھی ہو سکتی ہیں دلکش، سلم اور اسمارٹ وہ بھی آسانی سے تو چلیں پھر شروع کرتے ہیں۔

لیموں ہاضمہ بہتر بنانے کا بہترین زریعہ ہے، یہ ہمارے جسم سے زہریلے مادوں کا خاتمہ کرتا ہے، اس میں غذائی ریشہ موجود ہوتا ہے جو بدہضمی، اسہال اور قبض کا بھی علاج کرتا ہے اور اس کا استعمال آنتوں کی صحت بھی بہتر بناتا ہے۔ لیموں کا رس پینے سے ہم موسمی بیماریوں فلو اور وائرل انفیکشن سے بچ سکتے ہیں جیسے نزلہ، بخار اور وائرل انفیکشن وغیرہ۔ لیموں میں موجود پوٹاشیم کی وافر مقدار بلڈ پریشر کا قدرتی علاج کرتی ہے اور یہ دل کی صحت برقرار رکھتا ہے۔ لیموں میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس کینسر کو پھیلنے سے روکتے ہیں، ڈاکٹرز بھی کینسر سے بچنے کے لیے لیموں کے رس کا استعمال کرنے کی تجویز دیتے ہیں۔ لیموں کا رس اگر قہوے میں ملا کر پیا جائے تو اس سے وزن میں کمی آتی ہے، صرف نیم گرم پانی میں آدھے لیموں کا رس نچوڑ کر اگر روزانہ صبح نہار منہ پیا جائے تو اس سے وزن تیزی سے کم ہوگا اور جسم کی اضافی چربی گھلے گی۔

(بحوالہ:www.kainatnews.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' جنوری 2022 سرورق پر خوش وخرم جولانی او ردرون مجلّہ نئے سال اور یوم جمہوریہ کی مبارکباد کے ساتھ موصول ہوا۔ آپ تمام اور آپ کے قارئین کرام کو بھی یہ دونوں مبارکبادیاں قبول ہوں۔اداریہ میں یہ ناصحانہ پیام دیا گیا ہے کہ عزم صمیم اور محنت شاقہ حصولِ اہداف کے لیے لازم ہیں اور خواتین کی اپنے حقوق سے واقفیت کی خاطر زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہونا چاہیے۔ تعلیم نسواں کی تعمیم سے سابقہ مسائل حل ہونے چاہیے نہ کہ نئے مسائل رونما ہوں۔نسوانی بیداری ہم سب کا فرض عین ہے۔اداریہ کے علاوہ اس شمارہ میں دس اصناف سخن سے اس کے مشمولات ترتیب دیئے گئے ہیں جو 62 صفحات تک وسعت رکھتے ہیں۔شخصیت (ص5) کے ذیل میں بہار شریف کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ جمیلہ خاتون کا ذکر ہے۔ان دنوں معروف و غیر معروف ادباء پر مضامین لکھنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ایسے مضامین میں یا تو موضوع پس منظر میں چلا جاتا ہے یا پھر مصنف/مصنفہ۔ خیر۔''نکہت سخن'' (ص12) کے ذیل میں کوئی آٹھ شاعرات کے دو دو اشعار شامل ہیں جن سے ذہن کو تازگی کا پُرسکون احساس ہوتا تو ہے مگر یہ شعر دیکھیے

ہوا سرکش اندھیرا سخت جاں ہے
چراغوں کو مگر کیا کیا گماں ہے

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں چراغوں سے لیکر گماں تک جمع کا صیغہ ہے اور ردیف میں واحد کا اعلان ہو رہا ہے۔''جہانِ نسواں'' کے پانچوں گلزاروں میں معلومات کی بہاریں چھائی ہوئی ہیں۔''افسانہ'' کے تحت (ص48) پر دو افسانے دیے گئے ہیں۔افسانہ''ذمہ دار کون'' غیر ذمہ داری کا فسانہ ہے اور ''روشنی کے سائے'' گو کہ پر اثر روداد ہے پر بار بار سنی سنائی لگتی ہے۔''باورچی خانہ'' (ص56) میں لذیذ پکوانوں کی تفصیلات درج ہیں۔''صحت'' (ص58) میں اوائل عمری میں نمودار ہونے وال تبدیلیوں سے واقف کرانا اور ضروری ہوتا ہے تا کہ ان کے مطابق ضروری احتیاط روا رکھی جا سکے۔''آرائش و زیبائش'' (ص60) کے تحت حسن کی نگہداشت کے نکات گنائے گئے ہیں جبکہ ''تاثرات'' (ص62) میں ایک تاثراتی خط درج ہے۔

اس حسین ترین مجلّہ کے مطالعہ کے بعد اس کے بارے میں یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ بقول شکیل

میرے لیے بہار بھی تو گل بدن بھی تو
پروانہ اور شمع بھی تو انجمن بھی تو

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، (مہاراشٹرا) □□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دیوان داراشکوہ

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 208

قیمت: 125 روپے

علم البیان: اقسام نثر و نظم

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

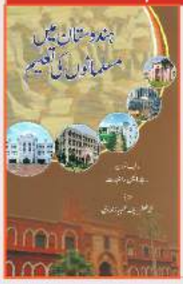

ترتیب و تدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

مغربی تعلیم اور مسلمان

مصنف و مترجم: مسرور علی اختر ہاشمی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 240

قیمت: 130 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

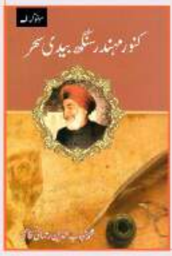

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, फरवरी -२०२२ वर्ष:६ ,अंक: २

Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2022, Vol.6 , Issue:2

National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-02-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6